صفر المظفر ۱۴۳۴ھ
دسمبر ۲۰۱۲ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مُذمّتِ بدعت
"اربعین نوویؒ" کی ایک حدیث کی تفہیم
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمۂ قرآن پر مشتمل
بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ و سُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(چھٹا ایڈیشن) ———— صفحات: 360، قیمت 450 روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(چوتھا ایڈیشن) ———— صفحات 321، قیمت 400 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
(دوسرا ایڈیشن) ———— صفحات 331، قیمت 400 روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(پہلا ایڈیشن) ———— صفحات 394، قیمت 450 روپے

★ عمدہ طباعت ★ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ★ امپورٹڈ پیپر

ملنے کے پتے
انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا پشاور
A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: 2584824,2214495(091)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا ”ہم نے مانا اور اطاعت کی!“

ماہنامہ
میثاق لاہور
اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 61
شمارہ : 12
صفر المظفر 1434ھ
دسمبر 2012ء
فی شمارہ -/25
اس شمارے کی قیمت 50 روپے

مُدیر
حافظ عاکف سعید
نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون
- اندرون ملک 250 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مجلد جدید پریس (پرائیویٹ) چگلا

مشمولات

عرضِ احوال	غزہ میں یہودی درندگی	ایوب بیگ مرزا	3
بیان القرآن	سورۂ یونس (آیات ۳۱۔۱۰۹)	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	5
مطالعہ حدیث	مذمتِ بدعت	ڈاکٹر اسرار احمد	39
علومِ قرآنی	سورۃ الفاتحہ کی تفسیر: انواعِ توحید کے نقطہ نظر سے	حافظ محمد مشتاق ربانی	56
تعمیرِ سیرت	’حق‘ اپنے مفہوم کے آئینے میں	عتیق الرحمٰن صدیقی	63
تذکیر وموعظت	حیاتِ مستعار کی قدر و قیمت	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	71
توبہ کی پکار	مایوسی گناہ ہے!	شمس الحق اعوان	76
احکام الجنائز	میت کے حقوق اور ان کی ادائیگی کا مسنون طریقہ	حافظ محمد زاہد	83
دعوتِ فکر	پاکستان کی موجودہ حالتِ زار: سورۂ ابراہیم کی روشنی میں	محمد نذیر یٰسین	97
شخصیات	مولانا ابوالکلام آزادؒ کی شخصیت	عبدالرشید عراقی	114
افکار وآراء	اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت	سید محمد افتخار احمد	131
حقوق وفرائض (۴)	حقوق و فرائض کی دینوی سطح پر چند مثالیں	بیگم ڈاکٹر عبدالخالق	135

اطلاع برائے قارئین

قارئین نوٹ فرمالیں کہ میثاق کی پیش نظر اشاعت دو ماہ (نومبر۔دسمبر۲۰۱۲ء) کے قائم مقام ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غزہ میں اسرائیلی درندگی

مغرب کی پشت پناہی اور مسلم ممالک کی بے حمیتی

اسرائیل نے ایک بار پھر وحشی پن اور بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہفتہ بھر غزہ کے شہریوں پر بمباری کی اور ۱۵۰ کے قریب مسلمانوں کو شہید اور ایک کثیر تعداد کو زخمی کر دیا۔ مغربی استعمار جو اسرائیل کی پشت پناہی بھی کرتا ہے اور اسے شہ بھی دیتا ہے جب دیکھتا ہے کہ اس درندگی سے عربوں کو خوفزدہ کرنے کا عمل مناسب سطح پر ہو گیا ہے ان پر ہیبت طاری ہو گئی ہے اور اگلے مرحلے میں انہیں سیاسی سطح پر مزید دبانے کا عمل حسن و خوبی سے ہو سکتا ہے تو وہ جنگ بندی کروا دیتا ہے۔ کہنے کو اصل مسئلہ یہ تھا کہ جنوری ۲۰۱۳ء میں ہونے والے انتخابات میں نیتن یاہو کو یہودی ووٹوں کی ضرورت تھی اور اسرائیلی ووٹر مسلمانوں کا خون بطور تاوان وصول کرنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس درندگی کا یہی سبب ہو۔ اس لیے کہ اس طرح کا خونی کھیل گزشتہ انتخابات سے پہلے بھی کھیلا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہودی دراصل اس مسلسل خون خرابے سے کیا چاہتا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے اس قوم کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہو گا جو فساد پھیلانے اور سازشیں کرنے سے بھری پڑی ہے۔ صرف چند مثالیں پیش کیے دیتے ہیں۔

یہودیوں نے عیسائیت کو سبوتاژ کرنے کے لیے شب خون مارا۔ سینٹ پال نامی یہودی نے عیسائی رہنما کا روپ دھار کر عیسائیت کا رخ ہی تبدیل کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ ہجرت فرمائی تو یہودی آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی کے خلاف سازشیں کرتے رہے' یہاں تک کہ (معاذ اللہ) آپ ﷺ کو قتل کرنے کی کوشش بھی کی۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب مسلمان مصائب کا شکار تھے تو میثاقِ مدینہ کے دستخطی ہونے کے باوجود عین موقع پر ساتھ چھوڑ گئے۔ طارق بن زیاد نے جب سپین پر حملہ کیا تو عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کی' جبکہ مسلمانوں کے سپین میں زوال کی ایک وجہ یہ بھی بنے تھے' وغیرہ وغیرہ۔ اس قوم کی سرشت میں شرانگیزی اور سازش ہے۔ یہ بڑی ذہین اور محنتی قوم ہے۔ ان اوصاف کی بنیاد پر یہ دُنیوی ترقی

میں بڑی تیزی اور مہارت کا مظاہرہ کرتی ہے' لیکن تمام تر ذہانت اور عیاری کے باوجود یہ دل کی اندھی قوم ہے۔ اللہ کی قوت کا اندازہ لگانے اور اس کی حکمتوں کو سمجھنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ پھر یہ کہ ایسا نہیں ہے کہ دنیا ان کے مکر و فریب کو کبھی سمجھ نہ پائی ہو۔ عیسائیوں نے جب حضرت عمر ؓ کو شہر کی چابیاں پیش کیں تو ان سے عہد لیا کہ وہ یہودیوں کو اس شہر میں گھسنے نہیں دیں گے۔ حضرت عمر ؓ نے یہ عہد تو کر لیا کہ انہیں یہاں بسنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور مسلمان اس پر قائم بھی رہے' البتہ انہیں عبادت کے لیے آنے سے روکا نہ گیا اور نہ ہی اس کا عہد کیا گیا۔

۱۷۷۶ء میں جب امریکہ آزاد ہوا تو بنجمن فرینکلن نے' جو امریکہ کے سات فاؤنڈر فادرز میں سے ایک تھا' انتہائی اصرار سے کہا کہ یہ طے کر لو کہ یہودی امریکہ میں آباد نہیں ہوں گے۔ ان کی بات مان لی جاتی تو آج امریکی گردن یہودی پنجے میں پھنسی نہ ہوتی۔ ہٹلر نے کہا تھا کہ میں نے جو یہودی زندہ چھوڑے ہیں وہ اس لیے چھوڑے ہیں تاکہ آنے والی دنیا جان سکے کہ میں نے انہیں مارا کیوں تھا؟ یہ اللہ کے ساتھ مکر کرتے ہیں جب کہ اللہ بہترین چال چلنے والا ہے۔ لہٰذا ان کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کریں' آپ کو سانپ اور سیڑھی کا کھیل نظر آئے گا۔ ان کی پیٹھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کے کوڑے بری طرح برستے رہے ہیں۔ کبھی یہ بخت نصر کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے تو کبھی ہٹلر نے ان کا قلع قمع کیا۔ واقعہ یہ ہے ذلت و رسوائی اس قوم کے مقدر میں ہے' لیکن بہر حال انہیں ”اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ“ کا استثناء بھی حاصل ہے۔ یعنی ”سوائے یہ کہ (انہیں کسی وقت) اللہ کا کوئی سہارا حاصل ہو جائے یا لوگوں کی طرف سے کوئی پشت پناہی حاصل ہو جائے!“

اب آئیے' غزہ کے حالیہ واقعات کی طرف! اس کے لیے غزہ کی کسی قدر تاریخ اور جغرافیہ کا جائزہ لینا ہو گا۔ غزہ کا تاریخی شہر اسرائیل اور مصر کی سرحد پر بحیرۂ روم کے تنگ ساحلی علاقے کی پٹی پر واقع ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے پردادا ہاشم کی قبر بھی غزہ ہی میں ہے۔ اسی نسبت سے اسے غزہ ہاشم بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے زمانے میں اسے اسلامی سلطنت میں شامل کیا گیا۔ اموی اور عباسی دور میں بھی غزہ کو اسلامی سلطنت میں اہم انتظامی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت عمر فاروق ؓ کے دور میں ایک عظیم الشان مسجد غزہ میں تعمیر ہوئی جسے مسجد عمرؓ کا نام دیا گیا۔ صلیبی جنگوں کے دوران عیسائیوں نے فاطمی حکمرانوں سے غزہ کا شہر

(باقی صفحہ ۱۴۳ پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃ یُونس

آیات ۳۱ تا ۳۹

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ
وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ
فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا
بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ښ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى
الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ قُلْ ھَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا
الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾
قُلْ ھَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۭ
اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ
فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُھُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا
يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَـيْــــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَمَا كَانَ ھٰذَا
الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ
وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ
قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۭ
كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾

آیت ۳۱ ﴿قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ﴾
’’(اے نبی ﷺ! ان سے) پوچھئے کہ کون ہے جو تمہیں رزق پہنچاتا ہے آسمان اور زمین سے یا کون ہے جس کے قبضۂ قدرت میں ہیں تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں؟‘‘

﴿وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ﴾ ’’اور کون ہے جو نکالتا ہے زندہ کو مُردہ سے اور مردہ کو زندہ سے‘ اور کون ہے تدبیرِ اَمر کرنے والا؟‘‘

﴿فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ﴾ ’’تو وہ کہیں گے اللہ!‘‘

مشرکین مکہ اللہ کو ان تمام صفات کے ساتھ مانتے تھے اور اس بارے میں ان کے ذہنوں میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نہ صرف اس کائنات کا خالق ہے بلکہ اس کا نظام بھی وہی چلا رہا ہے۔

﴿فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾﴾ ’’تو آپ فرمایئے کہ کیا پھر تم (اُس اللہ سے) ڈرتے نہیں ہو؟‘‘

جب تم لوگ اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق‘ مالک اور رازق مانتے ہو‘ جب تم مانتے ہو کہ کائنات کا یہ سارا نظام اللہ ہی اپنے حسن تدبیر سے چلا رہا ہے تو پھر اس کے بعد تمہارے ان مشرکانہ نظریات اور دیوی دیوتاؤں کی اس پوجا پاٹ کا کیا جواز ہے؟ کیا تمہیں کچھ بھی خوفِ خدا نہیں ہے؟

آیت ۳۲ ﴿فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ښ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾﴾ ’’تو وہی ہے اللہ تمہارا ربّ برحق۔ تو حق کے بعد کیا رہ جاتا ہے سوائے گمراہی کے؟ تو کہاں سے تم پھیرے جا رہے ہو؟‘‘

یہی حق ہے جس کو تم اپنی فطرت کی نظر سے پہچان چکے ہو۔ اب اسی کو مضبوطی سے تھام لو اور پھر سے گمراہی میں مبتلا ہونے سے بچ جاؤ۔ یعنی تمہاری فطرت کے اندر حق کی پہچان موجود ہے۔ اس کی گواہی خود تمہاری اپنی زبانیں دے رہی ہیں۔ تم اللہ کو اپنا اور اس کائنات کا خالق و مالک مانتے ہو‘ زبان سے اس کا اقرار کرتے ہو۔ تو یہاں تک پہنچ کر پھر کیوں گمراہی میں اوندھے منہ گر جاتے ہو۔ تمہاری عقل کہاں الٹ جاتی ہے؟

آیت ۳۳ ﴿كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾

''اسی طرح تیرے رب کی بات سچ ثابت ہوئی نافرمان لوگوں پر کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

آیت ۳۴ ﴿قُلۡ ہَلۡ مِنۡ شُرَکَآئِکُمۡ مَّنۡ یَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ ؕ﴾ ''ان سے پوچھیے کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو تخلیق کرتا ہو پہلی مرتبہ اور پھر اسے دوبارہ بھی بنائے؟''

﴿قُلِ اللّٰہُ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۳۴﴾﴾ ''آپ کہیے صرف اللہ ہی ہے جو پہلی مرتبہ بھی پیدا کرتا ہے' پھر وہ اسے دوبارہ بھی بنائے گا' تو تم کہاں سے پلٹائے جارہے ہو؟''

پھر تم یہ کس اُلٹی راہ پر چلائے جارہے ہو؟ تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو؟

آیت ۳۵ ﴿قُلۡ ہَلۡ مِنۡ شُرَکَآئِکُمۡ مَّنۡ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ ؕ﴾ ''ان سے پوچھیے کہ ہے کوئی تمہارے شریکوں میں سے جو حق کی طرف راہنمائی کر سکے؟''

﴿قُلِ اللّٰہُ یَہۡدِیۡ لِلۡحَقِّ ؕ﴾ ''آپ کہیے کہ اللہ ہی ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔''

﴿اَفَمَنۡ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ اَحَقُّ اَنۡ یُّتَّبَعَ اَمَّنۡ لَّا یَہِدِّیۡۤ اِلَّاۤ اَنۡ یُّہۡدٰی ۚ﴾ ''تو کیا جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ زیادہ مستحق ہے اس کا کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود ہدایت نہیں پاسکتا' اِلاّ یہ کہ اس کی راہنمائی کی جائے؟''

تمام مخلوق کو ہدایت دینے والا اللہ ہے۔ چنانچہ ہدایت وراہنمائی کے لیے سب اسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ خود نبی مکرم ﷺ بھی اللہ ہی سے یہ دعا مانگتے تھے: ﴿اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ﴾ تو بھلا وہ جو ہدایت دیتا ہے اس کی بات مانی جانی چاہیے یا اُن کی جو خود ہدایت کے محتاج ہوں؟

﴿فَمَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''تو تمہیں کیا ہوگیا ہے' تم کیسے فیصلے کرتے ہو!''

آیت ۳۶ ﴿وَمَا یَتَّبِعُ اَکۡثَرُہُمۡ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡئًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ

عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۶﴾﴾ ''اور نہیں پیروی کر رہے ان میں سے اکثر مگر گمان کی' اور یہ گمان کسی بھی درجے میں (انسان کو) حق سے مستغنی نہیں کر سکتا۔ یقیناً اللہ جانتا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔''

آیت ۳۷ ﴿وَمَا کَانَ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ اَنۡ یُّفۡتَرٰی مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ﴾ ''اور یہ قرآن ایسی شے نہیں ہے جس کو اللہ کے سوا (کہیں اور) گھڑ لیا گیا ہو''

یہ قرآن کسی انسان کے ہاتھوں تصنیف کی جانے والی کتاب نہیں ہے۔

﴿وَلٰکِنۡ تَصۡدِیۡقَ الَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَتَفۡصِیۡلَ الۡکِتٰبِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''بلکہ یہ تو تصدیق (کرتے ہوئے آیا) ہے اُس کی جو اس کے سامنے ہے اور (اس میں تمام) شریعت کی تفصیل ہے' اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ تمام جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔''

آیت ۳۸ ﴿اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ﴾ ''کیا یہ کہتے ہیں کہ اس کو پیغمبرؐ نے خود گھڑ لیا ہے؟''

یہ لوگ اس قرآن کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ محمد (ﷺ) کی اپنی تصنیف ہے۔ انہوں نے خود یہ کلام موزوں کر لیا ہے۔

﴿قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّثۡلِہٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''آپ (ان سے) کہیے کہ لے آؤ تم بھی ایک سورت اس جیسی اور (اس کے لیے) بلالو جس کو بلا سکتے ہو اللہ کے سوا' اگر تم سچے ہو۔''

یہ چیلنج سورۃ البقرۃ میں بھی ہے جو کہ مدنی ہے' جبکہ مکی سورتوں میں تو اسے متعدد بار دہرایا گیا ہے۔ سورۂ ہود میں اس جیسی دس سورتیں بنا کر لے آنے کا چیلنج دیا گیا ہے اور یہاں اس سورت میں یہ چیلنج گویا برسبیلِ تنزل آخری درجہ میں پیش کیا گیا ہے کہ چلو اس جیسی ایک سورت ہی بنا کر دکھا دو۔

آیت ۳۹ ﴿بَلۡ کَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ یُحِیۡطُوۡا بِعِلۡمِہٖ وَلَمَّا یَاۡتِہِمۡ تَاۡوِیۡلُہٗ ؕ﴾ ''(نہیں) بلکہ انہوں نے تکذیب کی ہے اس چیز کی جس کے علم کا یہ احاطہ نہیں کر سکے اور ابھی نہیں آئی ان کے پاس اس کی تاویل۔''

یعنی یہ لوگ قرآن کے علوم کا ادراک اور اس کے پیغام کا شعور حاصل نہیں کر سکے۔ اس کے علاوہ عذاب کے بارے میں ان کو دی گئی دھمکیوں کا مصداقِ خارجی بھی ابھی ان پر ظاہر نہیں ہوا' اس لیے وہ اس سب کچھ کو محض ڈراوا اور جھوٹ سمجھ رہے ہیں۔ قرآن میں ان لوگوں کو بار بار دھمکیاں دی گئی تھیں کہ اللہ کا انکار کرو گے تو اُس کی پکڑ میں آ جاؤ گے' اُس کی طرف سے بہت سخت عذاب تم پر آئے گا۔ یہ عذابِ موعود چونکہ ابھی ظاہری طور پر اُن پر نہیں آیا' اسی لیے وہ قرآن کو بھی جھٹلا رہے ہیں۔

﴿كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝٣٩﴾

''اسی طرح جھٹلایا تھا ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے تھے' تو دیکھو کیسا انجام ہوا ظالموں کا!''

آیات ۴۰ تا ۵۲

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝٤٠ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝٤١ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝٤٢ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝٤٣ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْــًٔـا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝٤٤ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝٤٥ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ۝٤٦ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝٤٧ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٤٨ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا

يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝٤٩ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝٥٠ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝٥١ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝٥٢

آیت ۴۰ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝٤٠﴾ ''ان میں وہ بھی ہیں جو اس پر ایمان لے آئیں گے اور وہ بھی ہیں جو ایمان نہیں لائیں گے' اور آپؐ کا رب ان مفسدوں سے خوب واقف ہے۔''

آیت ۴۱ ﴿وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ﴾ ''اور اگر یہ لوگ آپؐ کو جھٹلا دیں تو آپؐ کہیے کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل۔''

﴿اَنْتُمْ بَرِيْٓـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝٤١﴾ ''تم بری ہو میرے عمل کی ذمہ داری سے اور میں بری ہوں تمہارے اعمال کی ذمہ داری سے۔''

نہ میرے عمل کی کوئی ذمہ داری تم لوگوں پر ہے اور نہ تمہارے کیے کا میں ذمہ دار ہوں۔

آیت ۴۲ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ﴾ ''اور ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بڑی توجہ سے سنتے ہیں آپؐ (کی باتوں) کو۔''

﴿اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝٤٢﴾ ''تو کیا آپؐ بہروں کو سنا سکتے ہیں چاہے وہ عقل سے کام نہ لیتے ہوں!''

یہ لوگ تو پہلے سے ہی نہ سننے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں' اس لیے ان کے کان حق کی طرف سے بہرے ہو چکے ہیں۔ ان کا آپؐ کی باتوں کو سننا صرف دکھاوے کا سننا ہے تاکہ دوسرے لوگوں کو بتا سکیں کہ ہاں جی ہم تو محمد (ﷺ) کی محفل میں بھی جاتے ہیں' ساری باتیں بھی سنتے ہیں مگر ان میں ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں جسے مانا جائے۔

آیت ۴۳ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ﴾ ''اور ان میں ایسے بھی ہیں جو آپؐ کو دیکھتے ہیں۔''

﴿اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝٤٣﴾ ''تو کیا آپؐ اندھوں کو ہدایت دیں گے خواہ وہ دیکھتے نہ ہوں!''

چنانچہ جب ان لوگوں کی نیت ہی ہدایت حاصل کرنے کی نہیں ہے‘ جب ان کے دل ہی اندھے ہو چکے ہیں تو آپؐ کی مجلس میں آنا اور آپؐ کی صحبت میں بیٹھنا‘ اُن کے لیے ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔

آیت ۴۴ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾
”یقیناً اللہ انسانوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا‘ بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔“

آیت ۴۵ ﴿وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ﴾ ”اور جس دن وہ انہیں جمع کرے گا (تو وہ محسوس کریں گے) جیسے نہیں رہے وہ مگر دن کی ایک گھڑی‘ وہ ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے۔“
انہیں دنیا اور عالمِ برزخ میں گزرا ہوا وقت ایسے محسوس ہوگا جیسے کہ وہ ایک دن کا کچھ حصہ تھا۔

﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ”وہ لوگ بڑے خسارے کا شکار ہوئے جنہوں نے جھٹلا دیا اللہ کی ملاقات کو اور نہ ہوئے وہ ہدایت پانے والے۔“
آگے عذاب کی اُس دھمکی کا ذکر آ رہا ہے جس کے بارے میں آیت ۳۹ میں فرمایا گیا تھا: ﴿وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ﴾ کہ اس کی تاویل ابھی اُن کے پاس نہیں آئی۔

آیت ۴۶ ﴿وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ﴾ ”اور اگر ہم دکھا دیں آپؐ کو اس میں سے کچھ (عذاب) جس کا ہم اُن سے وعدہ کر رہے ہیں یا (اس سے پہلے ہی) ہم آپؐ کو وفات دے دیں“
﴿فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ”پس انہیں ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے‘ پھر اللہ گواہ ہے اُس پر جو وہ کر رہے ہیں۔“
یعنی آخری محاسبہ تو ان کا قیامت کے دن ہونا ہی ہے‘ مگر ہو سکتا ہے کہ یہاں دنیا میں بھی سزا کا کچھ حصہ ان کے لیے مختص کر دیا جائے۔ جیسا کہ بعد میں مشرکینِ مکہ پر عذاب آیا۔ ان پر آنے والے اس عذاب کا انداز پہلی قوموں کے عذاب سے مختلف تھا۔ اس عذاب کی پہلی قسط جنگِ بدر میں ان کے ستر سرداروں کے قتل اور ذلت آمیز شکست کی صورت میں سامنے

آئی‘ جبکہ دوسری اور آخری قسط ۹ ہجری میں وارد ہوئی جب انہیں الٹی میٹم دے دیا گیا: ﴿فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ ......﴾ (التوبۃ: ۲) کہ اب تمہارے لیے صرف چند ماہ کی مہلت ہے‘ اس میں ایمان لے آؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ اہلِ مکہ کے ساتھ عذاب کا معاملہ پہلی قوموں کے مقابلے میں شاید اس لیے بھی مختلف رہا کہ پہلی قوموں کی نسبت ان کے ہاں ایمان لانے والوں کی تعداد کافی بہتر رہی۔ مثلاً اگر حضرت نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سال کی تبلیغ سے ۸۰ لوگ ایمان لائے (میری رائے میں وہ لوگ ۸۰ بھی نہیں تھے) تو یہاں مکہ میں حضور ﷺ کی بارہ سال کی محنت کے نتیجے میں اہل ایمان کی تعداد اس سے دوگنا تھی اور ان میں حضرت ابوبکر‘ حضرت طلحہ‘ حضرت زبیر‘ حضرت عثمان‘ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف‘ حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہم جیسے بڑے بڑے لوگ بھی شامل تھے۔

آیت ۴۷ ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ﴾ ”اور ہر اُمت کے لیے ایک رسولؑ (بھیجا گیا) ہے۔“
﴿فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ”پھر جب آیا ان کا رسولؑ تو ان کے مابین عدل کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا گیا۔“
اس کی وضاحت کے لیے حضرت نوحؑ‘ حضرت ہودؑ‘ حضرت صالحؑ‘ حضرت شعیبؑ‘ حضرت لوط اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوموں کے معاملات کو ذہن میں رکھیے۔

آیت ۴۸ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾﴾ ”اور وہ کہتے ہیں کہ کب یہ (عذاب کا) وعدہ پورا ہوگا اگر تم سچے ہو؟“

آیت ۴۹ ﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ ”(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ میں تو خود اپنی جان کے لیے بھی کوئی اختیار نہیں رکھتا‘ نہ کسی ضرر کا نہ نفع کا‘ سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔“
﴿لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ﴾ ”ہر اُمت کے لیے ایک وقت معین ہے۔“
جیسے ہر اُمت کے لیے ایک رسولؑ ہے‘ اسی طرح ہر اُمت کے لیے اس کی اجل (مہلت کی مدت) بھی مقرر کر دی گئی ہے۔ اللہ کی مشیت اور حکمت کے مطابق ان کے لیے مقرر کردہ وقت بہرحال پورا ہو کر رہتا ہے۔
﴿اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾﴾ ”جب ان کا

وقت آ جاتا ہے تو پھر نہ تو وہ اس کو ایک گھڑی مؤخر کر سکتے ہیں اور نہ ہی اسے پہلے لا سکتے ہیں۔‘‘

آیت ۵۰ ﴿قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَتٰىکُمْ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا یَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾﴾ ’’(اے نبی ﷺ! ان سے) کہیے کیا تم نے غور کیا کہ اگر تمہارے اوپر اللہ کا عذاب (ناگہاں) آ دھمکے رات کو یا دن کے وقت‘ تو وہ کیا شے ہے جس کے بل پر یہ مجرم جلدی مچا رہے ہیں؟‘‘

یعنی یہ جو تم سینہ تان کر کہتے ہو کہ لے آؤ عذاب! اور پھر کہتے ہو کہ آ کیوں نہیں جاتا ہم پر عذاب! اور پھر استہزائیہ انداز میں استفسار کرتے ہو کہ یہ عذاب کا وعدہ کب پورا ہونے جا رہا ہے؟ تو کبھی تم لوگوں نے اس پہلو پر بھی غور کیا ہے کہ اگر وہ عذاب کسی وقت اچانک تم پر آ ہی گیا‘ رات کی کسی گھڑی میں یا دن کے کسی لمحے میں‘ تو اس سے حفاظت کے لیے تم نے کیا بندوبست کر رکھا ہے؟ آخر تم لوگ کس بل بوتے پر عذاب کو للکار رہے ہو؟ کس چیز کے بھروسے پر تم اس طرح جسارتیں کر رہے ہو؟

آیت ۵۱ ﴿اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾﴾ ’’پھر کیا جب وہ (عذاب) واقع ہو جائے گا تب تم لوگ اس پر ایمان لاؤ گے؟ (اُس وقت کہا جائے گا) کیا اب (ایمان لا رہے ہو)؟ اور اسی کی تو تم جلدی مچا رہے تھے۔‘‘

عذاب جب واقعتاً ظاہر ہو جائے گا تو اس وقت ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

آیت ۵۲ ﴿ثُمَّ قِیْلَ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾﴾ ’’پھر کہا جائے گا ان ظالموں سے کہ اب دائمی عذاب کا مزہ چکھو۔ تمہیں بدلہ نہیں دیا جا رہا ہے مگر تمہارے اپنے ہی کرتوتوں کا۔‘‘

آیات ۵۳ تا ۶۰

وَیَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِیْ وَرَبِّیْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔۚ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴿۵۳﴾ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِی الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ۬ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾

آیت ۵۳ ﴿وَیَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ واقعی حق ہے؟‘‘

جیسے قرآن بار بار اپنے مخالفین سے متجسسانہ انداز میں سوال (searching questions) کرتا ہے‘ اسی طرح مشرکین بھی حضور ﷺ سے searching انداز میں سوال کرتے تھے۔ یہاں ان کا یہ سوال نقل کیا گیا ہے کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں کیا واقعی یہ سچ ہے؟ کیا آپ کو خود بھی اس کا پورا پورا یقین ہے؟

﴿قُلْ اِیْ وَرَبِّیْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔ ؕ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴿۵۳﴾﴾ ’’آپ کہہ دیجیے کہ ہاں میرے رب کی قسم! یقیناً وہ حق ہے‘ اور تم (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے۔‘‘

ان الفاظ میں بہت زیادہ تاکید اور شدت ہے۔

آیت ۵۴ ﴿وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِی الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ﴾ ’’اور اگر کسی گنہگار جان کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو تو وہ اسے اس (عذاب) کے بدلے میں دے ڈالے۔‘‘

﴿وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ﴾ ’’اور وہ اپنی ندامت کو چھپائیں گے جب وہ دیکھیں گے عذاب کو۔‘‘

﴿وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾﴾ ’’اور ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔‘‘

آیت ۵۵ ﴿اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ! جو کچھ بھی ہے

آسمانوں اور زمین میں وہ اللہ ہی کی ملکیت ہے۔“

﴿اَلَاۤ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۵﴾﴾ ”آگاہ ہو جاؤ! یقیناً اللہ کا وعدہ حق ہے لیکن ان کی اکثریت علم نہیں رکھتی۔“

آیت ۵۶ ﴿ہُوَ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۵۶﴾﴾ ”وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اُسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے۔“

اگلی دو آیات عظمتِ قرآن کے ضمن میں ایک بیش بہا خزانہ اور افادیت کے اعتبار سے نہایت جامع آیات ہیں۔

آیت ۵۷ ﴿یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ مَّوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۬ۙ﴾ ”اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے اَمراض) کی شفا“

﴿وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۷﴾﴾ ”اور اہل ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔“

اس آیت کے الفاظ کی ترتیب (موعظہ‘ شفا‘ ہدایت اور رحمت) بہت پر حکمت ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۴ میں انسان کے دل کی سختی کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: ﴿ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ ......﴾۔ دراصل دل کی سختی ہی وہ بنیادی مرض ہے جس کے باعث اعلیٰ سے اعلیٰ کلام بھی کسی انسان پر بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے: ع ”مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر“۔ چنانچہ قبولِ ہدایت کے لیے سب سے پہلے دلوں کی سختی کو دور کرنا ضروری ہے۔ جیسے بارش سے فائدہ اٹھانے کے لیے زمین کو نرم کرنا پڑتا ہے‘ سخت زمین بارش سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتی‘ بارش کا پانی اوپر ہی اوپر سے بہہ جاتا ہے‘ اس کے اندر جذب نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر انسان کا معدہ ہی خراب ہو تو کوئی دوسری دوائی اپنا اثر نہیں دکھاتی۔ لہٰذا انسان کی کسی بھی بیماری کے علاج کے لیے پہلے اُس کے معدے کو درست کرنا ضروری ہے۔

دلوں کی سختی کو دور کرنے کے لیے مؤثر ترین نسخہ وعظ و نصیحت (موعظہ) ہے۔ جب وعظ اور نصیحت سے دلوں میں گداز پیدا ہو گا تو پھر قرآن ان پر دوائی کی مانند اثر کر کے تکبر‘ حسد‘ بغض‘ حبِ دُنیا وغیرہ تمام امراض کو دور کر دے گا۔ حبِ دنیا میں دولت‘ اولاد‘ بیوی‘

شہرت وغیرہ کی تمام محبتیں شامل ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۴: ﴿زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّہَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الۡبَنِیۡنَ وَ الۡقَنَاطِیۡرِ الۡمُقَنۡطَرَۃِ مِنَ الذَّہَبِ وَ الۡفِضَّۃِ وَ الۡخَیۡلِ الۡمُسَوَّمَۃِ وَ الۡاَنۡعَامِ وَ الۡحَرۡثِ ؕ﴾۔ آیت زیر مطالعہ میں الفاظ کی ترتیب پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک انسان کے حق میں قرآن سب سے پہلے وعظ اور نصیحت ہے‘ پھر تمام امراضِ قلب کے لیے شفا اور پھر ہدایت۔ کیونکہ جب دل سے بیماری نکل جائے گی‘ دل شفایاب ہو گا تب ہی انسان قرآن کی ہدایت اور راہنمائی کو عملاً اختیار کرے گا‘ اور جب انسان یہ سارے مراحل طے کر کے قرآن کی ہدایت کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لے گا تو پھر اس کو انعامِ خاص سے نوازا جائے گا اور وہ ہے اللہ کی خصوصی رحمت۔ کیونکہ یہ قرآن ربِّ رحمان کی رحمانیت کا مظہرِ اَتم ہے: ﴿اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾﴾۔

آیت ۵۸ ﴿قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰہِ وَ بِرَحۡمَتِہٖ﴾ ”(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے“

یہ قرآن اللہ کے فضل اور رحمت کا مظہر اور بنی نوع انسان پر اس کا بہت بڑا احسان ہے۔ یہ سب سے بڑی دولت ہے جو اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کو عطا کی ہے۔

﴿فَبِذٰلِکَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا ؕ﴾ ”تو چاہیے کہ لوگ اس پر خوشیاں منائیں!“

”فرح“ کے معنی ہیں خوشی سے پھولے نہ سمانا‘ یعنی خوشی کے جذبے میں حد سے بڑھ جانا‘ اس لحاظ سے یہ جذبہ شریعتِ اسلامی میں قابل مذمت ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ لفظ قرآن میں زیادہ تر منفی مفہوم میں آیا ہے — جیسے سورۃ القصص میں قارون کے ذکر میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡفَرِحِیۡنَ ﴿۷۶﴾﴾ — لیکن یہاں پر تو اعلانِ عام ہو رہا ہے کہ اگر ”فرح“ کرنا ہی ہے تو دولتِ قرآن پر کرو! اگر تمہیں اترانا ہی ہے تو نعمتِ قرآن پر اتراؤ! اور اگر جشن ہی منانا ہے تو جشنِ قرآن مناؤ! ﴿فَبِذٰلِکَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا﴾

﴿ہُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾﴾ ”وہ کہیں بہتر ہے ان چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔“

یہ مال و دولتِ دنیا‘ یہ سامانِ آرائش و زیبائش‘ یہ اشیائے آسائش‘ یہ رنگا رنگ نعمتیں‘ غرض اس دنیا میں انسان اپنے لیے جو کچھ بھی اکٹھا کرتا ہے‘ اس سب کچھ سے کہیں بہتر قرآن کی دولت ہے۔

ان دو آیات میں قرآن کی اہمیت وعظمت کے بیان میں جو تاکید اور جلال ہے اس کی قدر دانی کا تقاضا ہے کہ تمام مسلمان اس تصور کو حرزِ جان بنالیں' ان آیات کو زبانی یاد کریں' الفاظ کی ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے استفادہ کی کوشش کریں اور قرآن کی تعلیم وتفہیم کے ذریعے سے دل کو نرم اور گداز کرنے کا سامان کریں' تاکہ اس کے اثرات دل کے اندر جذب ہو کر اپنا رنگ جمائیں (ع چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود)۔ اور اس طرح قرآن کے ذریعے اپنی دنیائے دل وجان میں انقلاب برپا کریں' تاکہ یہ ان کے لیے شفا' ہدایت اور رحمت بن جائے۔ آمین!

آیت ۵۹ ﴿قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ﴾ ''ان سے کہیے کہ تم نے کبھی غور کیا کہ اللہ نے تمہارے لیے جو رزق اتارا ہے تم نے اس میں سے (از خود) کسی کو حرام قرار دے دیا اور کسی کو حلال!''

﴿قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝۵۹﴾ ''ان سے پوچھئے کیا اللہ نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟''

سورۃ الانعام میں ان چیزوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے جنہیں وہ لوگ از خود حرام یا حلال قرار دے لیتے تھے۔ سورۃ المائدۃ میں بھی ان کی خود ساختہ شریعت کا ذکر ہے۔

آیت ۶۰ ﴿وَمَا ظَنُّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ﴾ ''اور جو لوگ اللہ سے جھوٹی باتیں منسوب کرتے ہیں' قیامت کے دن کے بارے میں ان کا کیا گمان ہے؟''

وہ کیا خیال رکھتے ہیں کہ اُس دن اِس جرم کے بدلے میں ان کے ساتھ کیسا سلوک ہوگا؟

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَشْكُرُوْنَ ۝۶۰﴾ ''یقیناً اللہ تو انسانوں کے حق میں بہت فضل والا ہے' لیکن ان کی اکثریت شکر گزار نہیں ہے۔''

آیات ۶۱ تا ۷۰

وَمَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ؕ وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ۝ؕ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ؕ وَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ؕ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ وَمَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ۝ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ۝ؕ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ۝ع

آیت ۶۱ ﴿وَمَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) نہیں ہوتے آپ کسی بھی کیفیت میں اور نہیں پڑھ رہے ہوتے آپ قرآن میں سے کچھ اور (اے مسلمانو!) تم نہیں کر رہے ہوتے کوئی بھی (اچھا) عمل''

﴿اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ؕ﴾ ''مگر یہ کہ ہم تمہارے پاس موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔''

اس اندازِ تخاطب میں ایک خاص کیف ہے۔ پہلے واحد کے صیغے میں حضور اکرم ﷺ سے خطاب ہے اور آپ ﷺ کو خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ آپ جس کیفیت میں بھی ہوں' قرآن پڑھ رہے ہوں یا پڑھ کر سنا رہے ہوں' ہم بذاتِ خود آپؐ کو دیکھ رہے ہوتے ہیں' آپؐ کی آواز سن رہے ہوتے ہیں۔ پھر اسی خوشخبری کو جمع کے صیغے میں تمام مسلمانوں کے لیے عام کر دیا گیا ہے کہ تم لوگ جو بھی بھلائی کماتے ہو' قربانیاں دیتے ہو' ایثار کرتے ہو' ہم خود اسے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہم تمہارے ایک ایک عمل کے گواہ اور قدردان ہیں۔ ہمارے ہاں اپنے بندوں کے بارے میں تغافل یا ناقدری نہیں ہے۔

﴿وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَلَآ

اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (٦١)﴾ ’’اور نہیں غائب ہوتی آپؐ کے رب سے زمین میں ایک ذرّہ کے برابر بھی کوئی شے اور نہ آسمانوں میں‘ اور نہ ہی اس سے کم تر کوئی شے اور نہ بڑی‘ مگر یہ کہ وہ ایک روشن کتاب میں درج ہے۔‘‘

کوئی ذرہ برابر چیز یا اس سے چھوٹی یا بڑی آسمانوں اور زمین میں ایسی نہیں ہے جو کبھی ربّ ذوالجلال کی نظر سے پوشیدہ ہوگئی ہو اور وہ ایک روشن کتاب میں درج نہ ہو۔ یہ روشن کتاب اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے۔

آیت ۶۲ ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (٦٢)﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔‘‘

یہ اولیاء اللہ کون لوگ ہیں؟ یہ کوئی علیحدہ نوع (Species) نہیں ہے‘ اور نہ ہی اس کے لیے کوئی خاص لباس زیب تن کرنے یا کوئی مخصوص حلیہ بنانے کی ضرورت ہے‘ بلکہ اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو ایمانِ حقیقی سے بہرہ مند ہوں‘ ان کے دلوں میں یقین پیدا ہو چکا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے درجہ ’’احسان‘‘ پر فائز ہو چکے ہوں‘ جس کا ذکر ’’حدیث جبریل‘‘ میں ہوا ہے: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))(۱) اللہ تعالیٰ اپنے ان خاص بندوں کی جس طرح پذیرائی فرماتا ہے اس کا ایک انداز سورۃ البقرۃ‘ آیت ۲۵۷ میں اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ ’’اللہ ولی ہے اہل ایمان کا‘ انہیں نکالتا ہے اندھیروں سے روشنی کی جانب‘‘۔ آیت زیر نظر میں بھی انہیں خوشخبری سنائی گئی ہے کہ ایسے لوگ خوف اور حُزن سے بالکل بے نیاز ہوں گے۔ بہرحال اس سلسلے میں ایک بہت اہم نکتہ لائق توجہ ہے کہ جو اللہ کا دوست ہوگا اس کے اندر اللہ کی غیرت و حمیت بھی ہوگی۔ وہ اللہ کے دین کو پامال ہوتے دیکھ کر تڑپ اٹھے گا۔ وہ اللہ کے شعائر کی بے حرمتی کو کبھی برداشت نہیں کر سکے گا۔ وہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے اپنا تن من دھن قربان کر دے گا۔ گویا دُنیوی زندگی میں یہ معیار اور طرزِ عمل اولیاء اللہ کی پہچان ہے۔ اگلی آیت میں مزید وضاحت فرما دی گئی کہ یہ اولیاء اللہ کون لوگ ہیں:

آیت ۶۳ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (٦٣)﴾ ’’وہ لوگ جو صاحب ایمان ہوں اور تقویٰ کی روش اختیار کریں۔‘‘

---

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان الایمان والاسلام والاحسان۔

اور یہ تقویٰ کس طرح اہل ایمان کو درجہ بدرجہ بلند سے بلند کرتا چلا جاتا ہے اس کی تفصیل ہم سورۃ المائدۃ کی اس آیت کے ضمن میں پڑھ چکے ہیں: ﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (٩٣)﴾

آیت ۶۴ ﴿لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۭ﴾ ’’اُن کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی بشارتیں ہیں اور آخرت میں بھی۔‘‘

ان بشارتوں کے بارے میں ہم سورۃ التوبہ کی آیت ۵۲ میں پڑھ چکے ہیں: ﴿هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ﴾ یعنی ہمارے لیے تو دو اچھائیوں کے سوا کسی تیسری چیز کا تصور ہی نہیں ہے‘ ہمارے لیے تو بشارت ہی بشارت ہے۔ اور اگر بالفرض دنیا میں کوئی تکلیف آ بھی جائے تو بھی کوئی غم نہیں‘ کیونکہ ہمارے اوپر جو بھی تکلیف آتی ہے وہ ہمارے رب ہی کی طرف سے آتی ہے۔ جیسے سورۃ التوبہ آیت ۵۱ میں فرمایا گیا: ﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ﴾ چنانچہ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ وہ ہمارا دوست ہے‘ اور دوست کی طرف سے اگر کوئی تکلیف بھی آ جائے تو سر آنکھوں پر۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس تکلیف میں بھی ہمارے لیے خیر اور بھلائی ہی ہوگی۔

﴿لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (٦٤)﴾ ’’اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی تو ہے بہت بڑی کامیابی۔‘‘

آیت ۶۵ ﴿وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) ان کی باتیں آپؐ کو رنجیدہ نہ کریں۔‘‘

﴿اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (٦٥)﴾ ’’عزت کُل کی کُل اللہ کے اختیار میں ہے‘ وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔‘‘

آیت ۶۶ ﴿اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ! اللہ ہی کے (مملوک) ہیں جو کوئی بھی آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں۔‘‘

﴿وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ۭ﴾ ’’اور یہ لوگ جو اللہ کے علاوہ (اُس کے) شریکوں کو پکار رہے ہیں وہ کسی چیز کا اتباع نہیں کر رہے۔‘‘

﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (٦٦)﴾ ’’وہ تو ظن و تخمین ہی کے

پیچھے پڑے ہیں اور صرف اٹکل سے کام لیتے ہیں۔''

آیت ۶۷ ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ﴾ ''وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تا کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو بنا دیا روشن۔''

رات کو پُرسکون بنایا تا کہ رات کے وقت آرام کرو' اور دن کو روشن بنایا تا کہ اس میں اپنی معاشی ذمہ داریاں نبھاؤ اور دوسرے کام کاج نپٹاؤ۔

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۶۷﴾ ''یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو سنتے ہوں۔''

آیت ۶۸ ﴿قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ﴾ ''انہوں نے کہا کہ اللہ نے اولاد اختیار کی ہے' وہ (ایسی باتوں سے) پاک ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔''

اللہ کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ اسے اولاد کی حاجت ہو۔ یہاں ''غنی'' کا لفظ اس لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اولاد کی تمنا آدمی اس لیے کرتا ہے کہ اس کا سہارا بنے اور مرنے کے بعد اس کے ذریعے دنیا میں اس کا نام باقی رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ ایسی حاجتوں سے پاک ہے۔ وہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے' وہ ہر حاجت سے غنی اور بے نیاز ہے' اسے اولاد سمیت کسی چیز کی ضرورت اور حاجت نہیں ہے۔

﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ ''اُسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں۔''

﴿اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ﴾ ''نہیں ہے تمہارے پاس کوئی سند (دلیل) اس کے لیے۔''

﴿اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۶۸﴾ ''کیا تم اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہو وہ چیز جس کے متعلق تمہیں علم ہی نہیں!''

تمہارے پاس کوئی علمی سند یا عقلی دلیل اس بات کے حق میں نہیں ہے جو تم اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہو۔

آیت ۶۹ ﴿قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۶۹﴾ ''(اے نبیﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ جو لوگ اللہ کی طرف جھوٹ باتیں منسوب کرتے ہیں وہ کبھی

فلاح نہیں پائیں گے۔''

آیت ۷۰ ﴿مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ﴾ ''دنیا میں (ان کے لیے) برتنے کی کچھ چیزیں ہیں' پھر ہماری ہی طرف ان کا لوٹنا ہے''

دنیا کی چند روزہ زندگی کا فائدہ اٹھانے کے لیے انہیں کچھ ساز و سامان دے دیا گیا ہے' پھر ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہوگی۔

﴿ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۷۰﴾ ''پھر ہم انہیں مزہ چکھائیں گے بہت سخت عذاب کا' اس کفر کی وجہ سے جو وہ کرتے رہے ہیں۔''

آیات ۷۱ تا ۷۴

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ
وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا
يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا
سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ
الْمُسْلِمِيْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ
وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝ ثُمَّ
بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا
بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

اب انباء الرسل کے سلسلے میں دو رکوع آ رہے ہیں' جن کا آغاز سورت میں ذکر ہوا تھا کہ ان میں پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر بہت اختصار کے ساتھ (آدھے رکوع میں) ہے اور بعد میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر قدرے تفصیل سے (ڈیڑھ رکوع میں) آیا ہے۔ درمیان میں صرف حوالہ دیا گیا ہے کہ ہم نے مختلف قوموں کی طرف رسولوں کو بھیجا' اس سلسلے میں کسی رسولؑ کا نام نہیں لیا گیا۔

آیت ۷۱ ﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ﴾ ''اور ان کو سنائیے نوحؑ کی خبر۔''

﴿اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكُمۡ مَّقَامِىۡ وَتَذۡكِيۡرِىۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ ''جب اُس ؑ نے کہا اپنی قوم سے کہ اے میری قوم کے لوگو! اگر تم پر بڑا بھاری گزر رہا ہے میرا کھڑا ہونا اور اللہ کی آیات کے ساتھ نصیحت کرنا''

میرا دعوتِ حق کے ساتھ کھڑا ہونا اور تبلیغ و تذکیر کا میرا یہ عمل اگر تم پر بہت شاق گزر رہا ہے کہ تم میرا مذاق اڑاتے ہو اور مجھ پر آوازے کستے ہو تو مجھے تمہاری مخالفت کی کوئی پروا نہیں۔

﴿فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡتُ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَكُمۡ وَشُرَكَآءَكُمۡ﴾ ''تو میں نے بس اللہ پر توکل کرلیا ہے' پس تم جمع کرلو اپنے سارے ذرائع اور اپنے شریکوں کو (بھی بلالو)''

﴿ثُمَّ لَا يَكُنۡ اَمۡرُكُمۡ عَلَيۡكُمۡ غُمَّةً ثُمَّ اقۡضُوۡۤا اِلَىَّ وَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ۝٧١﴾ ''پھر تم پر تمہارا معاملہ کسی اشتباہ میں نہ رہ جائے' پھر جو فیصلہ میرے بارے میں کرنا ہے کر گزرو اور مجھے کوئی مہلت نہ دو۔''

اس طرزِ تخاطب سے اندازہ ہو رہا ہے کہ حضرت نوح ؑ کا دل اپنی قوم کے رویے کی وجہ سے کس قدر دکھا ہوا تھا' اور ایسا ہونا بالکل فطری عمل تھا۔ اللہ کے اس بندے نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو سمجھانے اور نصیحت کرنے میں دن رات ایک کر دیا تھا' اپنا آرام و سکون تک قربان کر دیا تھا' مگر وہ قوم تھی کہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال ان الفاظ میں اللہ کے رسول ؑ کی طرف سے ایک آخری بات چیلنج کے انداز میں کہی جا رہی ہے کہ تم لوگ اپنی ساری قوتیں مجتمع کرلو' تمام وسائل اکٹھے کرلو اور پھر میرے ساتھ جو کر سکتے ہو کر گزرو!

آیت ۷۲ ﴿فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ﴾ ''پھر اگر تم (اس سے) اعراض کرو'

﴿فَمَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ﴾ ''تو میں نے تم لوگوں سے (کبھی) کوئی اجر تو نہیں مانگا۔''

یعنی پھر اگر تم اس چیلنج کا سامنا نہ کرسکو اور میرے خلاف آخری اقدام کرنے کا حوصلہ بھی نہ کر پاؤ تو پھر ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچو تو سہی کہ میں پچھلے ساڑھے نو سو سال سے تمہیں راہِ راست پر لانے کی جدوجہد کر رہا ہوں اس کے عوض میں نے تم لوگوں سے کوئی معاوضہ' کوئی اُجرت' کوئی تعریف و توصیف' کوئی شاباش' الغرض کچھ بھی طلب نہیں کیا۔ تو کیا میرے اس طرزِ عمل سے تم لوگوں کو اتنی سی بات بھی سمجھ نہیں آتی کہ اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ حضرت نوح ؑ کا چیلنج قبول کر کے ان کے خلاف اقدام کرنے سے

گریزاں تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر ہم نے انہیں قتل کر دیا تو ہم پر کوئی بڑی مصیبت نازل ہو جائے گی۔

﴿اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۝٧٢﴾ ''میرا اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں اس کے فرمانبردار بندوں میں سے رہوں۔''

آیت ۷۳ ﴿فَكَذَّبُوۡهُ فَنَجَّيۡنٰهُ وَمَنۡ مَّعَهٗ فِى الۡفُلۡكِ وَجَعَلۡنٰهُمۡ خَلٰٓئِفَ﴾ ''تو انہوں نے (پھر بھی) جھٹلا دیا اُس ؑ کو' تو ہم نے نجات دے دی اُس کو اور جو بھی اُس کے ساتھ تھے کشتی میں اور ان کو بنا دیا جانشین''

انہی لوگوں کو ہم نے زمین میں خلافت عطا کی۔

﴿وَاَغۡرَقۡنَا الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ۝٧٣﴾ ''اور غرق کر دیا ہم نے ان لوگوں کو جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی' تو دیکھو کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جنہیں خبردار کر دیا گیا تھا!''

آیت ۷۴ ﴿ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوۡمِهِمۡ فَجَآءُوۡهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ﴾ ''پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد بہت سے رسولوں کو اُن کی (اپنی اپنی) قوموں کی طرف' تو وہ (سب کے سب) آئے اُن کے پاس روشن دلیلیں لے کر'

﴿فَمَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا بِمَا كَذَّبُوۡا بِهٖ مِنۡ قَبۡلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطۡبَعُ عَلٰى قُلُوۡبِ الۡمُعۡتَدِيۡنَ ۝٧٤﴾ ''لیکن وہ (ساری روشن دلیلیں دیکھنے کے باوجود بھی) اُس چیز پر ایمان لانے والے نہ بنے جس کا پہلے انکار کر چکے تھے۔ اسی طرح ہم مہر کر دیا کرتے ہیں حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر۔''

آیات ۷۵ تا ۸۲

ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ مُّوۡسٰى وَهٰرُوۡنَ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا
فَاسۡتَكۡبَرُوۡا وَكَانُوۡا قَوۡمًا مُّجۡرِمِيۡنَ ۝٧٥ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الۡحَقُّ مِنۡ عِنۡدِنَا
قَالُوۡۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۝٧٦ قَالَ مُوۡسٰٓى اَتَقُوۡلُوۡنَ لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمۡ ؕ
اَسِحۡرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفۡلِحُ السّٰحِرُوۡنَ ۝٧٧ قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِتَلۡفِتَنَا عَمَّا وَجَدۡنَا

عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا
بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۷۸ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝۷۹ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ
قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝۸۰ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ
بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۸۱
وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸۲

عام طور پر قرآن حکیم میں انباء الرسل کے ضمن میں چھ رسولوں کا تذکرہ بار بار آیا ہے‘ لیکن یہاں اختصار کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام کا صرف تین آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔ پھر اس ایک آیت (۷۴) میں باقی تمام رسولوں کا نام لیے بغیر صرف حوالہ دے دیا گیا ہے اور اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر قدرے تفصیل سے ہوا ہے۔

آیت ۷۵ ﴿ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا﴾ ’’پھر بھیجا ہم نے ان کے بعد موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرعون اور اس کے سرداروں کی جانب اپنی نشانیوں کے ساتھ‘‘

﴿فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝۷۵﴾ ’’تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ تھے مجرم لوگ۔‘‘

آیت ۷۶ ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۶﴾ ’’تو جب ان کے پاس حق آیا ہماری طرف سے تو انہوں نے کہا یہ تو کھلا جادو ہے۔‘‘

آیت ۷۷ ﴿قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ﴾ ’’موسیٰؑ نے کہا کہ کیا تم لوگ حق کے بارے میں یہ کہہ رہے ہو جبکہ وہ تمہارے پاس آ پہنچا ہے۔‘‘

﴿اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝۷۷﴾ ’’کیا یہ جادو ہے؟ اور جادوگر تو کبھی فلاح نہیں پایا کرتے۔‘‘

آیت ۷۸ ﴿قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا﴾ ’’انہوں نے کہا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمیں پھیر دو ان طریقوں سے جن پر پایا ہم نے اپنے آباء و اجداد کو‘‘

﴿وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۷۸﴾ ’’اور تم دونوں کی بڑائی قائم ہو جائے زمین میں؟ اور ہم ہرگز تم دونوں کی بات ماننے والے نہیں ہیں۔‘‘

یعنی تم دونوں (حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام) یہاں اپنی بادشاہی قائم کرنا چاہتے ہو۔ اس اندیشے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اہل مصر کو بندگیٔ رب کی جو دعوت دے رہے تھے اس سے وہ مشرکانہ نظام خطرے میں تھا جس پر فرعون کی بادشاہی‘ اس کے سرداروں کی سرداری اور مذہبی پیشواؤں کی پیشوائی قائم تھی۔

آیت ۷۹ ﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝۷۹﴾ ’’اور فرعون نے کہا کہ لے آؤ میرے پاس تمام ماہر جادوگروں کو۔‘‘

آیت ۸۰ ﴿فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝۸۰﴾ ’’اور جب وہ جادوگر آ گئے تو موسیٰؑ نے ان سے فرمایا کہ ڈالو جو تم ڈالنے والے ہو۔‘‘

آیت ۸۱ ﴿فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ﴾ ’’اور جب انہوں نے ڈال دیا تو موسیٰؑ نے فرمایا کہ تم لوگ جو کچھ لائے ہو یہ جادو ہے۔‘‘

یعنی جادو وہ نہ تھا جو میں نے دکھایا تھا‘ بلکہ جادو یہ ہے جو تم دکھا رہے ہو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۸۱﴾ ’’یقیناً اللہ اسے ابھی باطل کر دے گا۔ بے شک اللہ مفسدوں کے عمل کو کامیاب نہیں کرتا۔‘‘

اللہ تعالیٰ ابھی تمہاری شعبدہ بازی کا باطل ہونا ثابت کر دے گا‘ اسے نیست و نابود کر دے گا‘ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ فساد برپا کرنے والوں کے عمل کو نتیجہ خیز نہیں ہونے دیتا۔

آیت ۸۲ ﴿وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸۲﴾ ’’اور اللہ تو حق کو حق ثابت کرتا ہے اپنے کلمات سے‘ خواہ یہ مجرموں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔‘‘

آیات ۸۳ تا ۹۳

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ
اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۸۳

وَقَالَ مُوۡسٰى يٰقَوۡمِ اِنۡ كُنۡتُمۡ اٰمَنۡتُمۡ بِاللّٰهِ فَعَلَيۡهِ تَوَكَّلُوۡۤا اِنۡ كُنۡتُمۡ
مُّسۡلِمِيۡنَ ۝٨٤ فَقَالُوۡا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡنَا‌ ۚ رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً لِّلۡقَوۡمِ
الظّٰلِمِيۡنَ ۝٨٥ۙ وَنَجِّنَا بِرَحۡمَتِكَ مِنَ الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝٨٦ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰى
وَاَخِيۡهِ اَنۡ تَبَوَّاٰ لِقَوۡمِكُمَا بِمِصۡرَ بُيُوۡتًا وَّاجۡعَلُوۡا بُيُوۡتَكُمۡ قِبۡلَةً وَّاَقِيۡمُوا
الصَّلٰوةَ‌ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝٨٧ وَقَالَ مُوۡسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيۡتَ فِرۡعَوۡنَ
وَمَلَاَهٗ زِيۡنَةً وَّاَمۡوَالًا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِكَ‌ ۚ رَبَّنَا
اطۡمِسۡ عَلٰٓى اَمۡوَالِهِمۡ وَاشۡدُدۡ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡا حَتّٰى يَرَوُا
الۡعَذَابَ الۡاَلِيۡمَ ۝٨٨ قَالَ قَدۡ اُجِيۡبَتۡ دَّعۡوَتُكُمَا فَاسۡتَقِيۡمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ
سَبِيۡلَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝٨٩ وَجٰوَزۡنَا بِبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ الۡبَحۡرَ فَاَتۡبَعَهُمۡ
فِرۡعَوۡنُ وَجُنُوۡدُهٗ بَغۡيًا وَّعَدۡوًا‌ ؕ حَتّٰٓى اِذَاۤ اَدۡرَكَهُ الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ اَنَّهٗ
لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِىۡۤ اٰمَنَتۡ بِهٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِيۡلَ وَاَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۝٩٠ آٰلۡـٰٔنَ وَقَدۡ
عَصَيۡتَ قَبۡلُ وَكُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ۝٩١ فَالۡيَوۡمَ نُنَجِّيۡكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوۡنَ
لِمَنۡ خَلۡفَكَ اٰيَةً‌ ؕ وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ عَنۡ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوۡنَ ۝٩٢ۧ وَلَقَدۡ
بَوَّاۡنَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ مُبَوَّاَ صِدۡقٍ وَّرَزَقۡنٰهُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ‌ ۚ فَمَا اخۡتَلَفُوۡا
حَتّٰى جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ‌ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقۡضِىۡ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ
يَخۡتَلِفُوۡنَ ۝٩٣

آیت ۸۳ ﴿فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوۡسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنۡ قَوۡمِهٖ﴾ ''تو کوئی ایمان نہیں لایا موسیٰؑ پر مگر چند نوجوان اُس کی قوم میں سے''

﴿عَلٰى خَوۡفٍ مِّنۡ فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهِمۡ اَنۡ يَّفۡتِنَهُمۡ‌ ؕ﴾ ''ڈرتے ہوئے فرعون اور اپنے سرداروں سے کہ وہ اُن کو مصیبت میں مبتلا نہ کر دیں۔''

اُس وقت مصر پر قبطی قوم حکمران تھی‘ جسے قرآن نے ''آلِ فرعون'' کہا ہے اور اسرائیلی ان کے محکوم تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کی آزادی کے علمبردار تھے‘ لیکن اس

کے باوجود بنی اسرائیل میں سے بھی صرف چند نوجوان لڑکوں نے ہی آپؑ کی دعوت پر لبیک کہا تھا۔ دراصل غلام ہونے کی وجہ سے وہ لوگ فرعون اور اس کے سرداروں کے مظالم سے خوف زدہ تھے۔ عام طور پر ہر محکوم قوم کے ساتھ اسی طرح ہوتا ہے کہ اس کے کچھ لوگ اپنی قوم سے غداری کر کے حکمرانوں سے مل جاتے ہیں اور حکمران انہیں مراعات اور خطابات سے نواز کر ان کی وفاداریاں خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں سے بھی کچھ لوگ فرعون کے ایجنٹ بن چکے تھے۔ اس کی سب سے بڑی مثال قارون کی ہے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا‘ مگر فرعون کا درباری اور اس کا ایجنٹ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازشیں کرتا رہتا تھا (اس کا تفصیلی ذکر سورۃ القصص میں ہے)۔ بہرحال بنی اسرائیل کے عام لوگ ایسے مخبروں کے ڈر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قریب ہونے سے گریز کرتے تھے۔ نوجوان چونکہ باہمت اور پرجوش ہوتے ہیں‘ اس لیے وہ اس طرح کی انقلابی آواز پر لبیک کہنے کا خطرہ مول لے لیتے ہیں‘ جبکہ اسی قوم کے ادھیڑ عمر لوگ کم ہمتی اور مصلحتوں کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ پورا فلسفہ اس آیت میں موجود ہے۔ ان آیات کے نزول کے وقت اہل مکہ میں سے بھی محمد رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دینے کے لیے جو لوگ آگے بڑھ رہے تھے وہ چند باہمت نوجوان ہی تھے‘ نہ کہ مصلحت کوش بوڑھے۔

﴿وَاِنَّ فِرۡعَوۡنَ لَعَالٍ فِى الۡاَرۡضِ‌ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الۡمُسۡرِفِيۡنَ ۝٨٣﴾ ''اور یقیناً فرعون زمین میں بہت سرکشی کر رہا تھا‘ اور وہ یقیناً حد سے بڑھ جانے والوں میں سے تھا۔''

آیت ۸۴ ﴿وَقَالَ مُوۡسٰى يٰقَوۡمِ اِنۡ كُنۡتُمۡ اٰمَنۡتُمۡ بِاللّٰهِ فَعَلَيۡهِ تَوَكَّلُوۡۤا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّسۡلِمِيۡنَ ۝٨٤﴾ ''اور موسیٰؑ نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لے آئے ہو تو اب اُسی پر توکّل بھی کرو اگر تم واقعتاً فرمانبردار بن گئے ہو۔''

آیت ۸۵ ﴿فَقَالُوۡا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡنَا‌ ۚ رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ۝٨٥﴾ ''تو انہوں نے کہا کہ ہم نے اللہ پر توکّل کیا۔ اے ہمارے رب! تو ہمیں ان ظالموں کے لیے تختۂ مشق نہ بنا دے۔''

اللہ پر توکل کرتے ہوئے ہم اپنا معاملہ اسی کے حوالے کرتے ہیں۔ پروردگار! اب ایسا نہ ہو کہ ہمارے ذریعے سے تو ان کو آزمائے۔ جیسے ابوجہل اگر آلِ یاسر پر ظلم ڈھاتا تھا تو اللہ

کے ہاں یہ اس کی بھی آزمائش ہو رہی تھی‘ لیکن اس آزمائش میں تختۂ مشق حضرت یاسر اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہما بن رہے تھے۔

آیت ۸۶ ﴿وَنَجِّنَا بِرَحۡمَتِكَ مِنَ الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ﴾ ’’اور ہمیں اپنی رحمت سے اس کافر قوم سے نجات عطا فرما۔‘‘

آیت ۸۷ ﴿وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰى وَاَخِيۡهِ اَنۡ تَبَوَّاٰ لِقَوۡمِكُمَا بِمِصۡرَ بُيُوۡتًا﴾ ’’اور ہم نے وحی کی موسیٰؑ اور اس کے بھائی (ہارونؑ) کو کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر معیّن کر لو‘‘

ان گھروں میں جمع ہو کر تم لوگ اللہ کی عبادت کیا کرو۔ اسی طرح کا انتظام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی دعوت کے ابتدائی زمانہ میں کیا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دارِ ارقم کو دعوتی اور تنظیمی سرگرمیوں کے لیے مختص فرمایا تھا۔

﴿وَّاجۡعَلُوۡا بُيُوۡتَكُمۡ قِبۡلَةً﴾ ’’اور بناؤ اپنے گھروں کو قبلہ رخ‘‘

فرعون کے ڈر سے وہ لوگ مسجد تو بنا نہیں سکتے تھے‘ اس لیے انہیں حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں کو تعمیر ہی قبلہ رخ کرو‘ تاکہ وہاں تم نمازیں پڑھا کرو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی قبلہ معیّن تھا جبکہ بیت المقدس تو ابھی بنا ہی نہیں تھا۔ بیت المقدس تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے ایک ہزار سال بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپؑ کی قوم کا قبلہ یہی بیت اللہ تھا۔ تورات میں ان کی قربان گاہوں کے خیموں کے بارے میں تفصیل ملتی ہے کہ یہ خیمے اس طرح نصب کیے جاتے تھے کہ جب کوئی شخص قربانی پیش کرتا تھا تو اس کا رخ سیدھا قبلہ کی طرف ہوتا تھا۔

﴿وَّاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ ’’اور نماز قائم رکھو‘ اور اہل ایمان کو بشارت دے دو۔‘‘

آیت ۸۸ ﴿وَقَالَ مُوۡسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيۡتَ فِرۡعَوۡنَ وَمَلَاَهٗ زِيۡنَةً وَّاَمۡوَالًا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۙ﴾ ’’اور موسیٰؑ نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار! تُو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو سامانِ زیب و زینت اور اموال عطا کر دیے ہیں دنیا کی زندگی میں‘‘

﴿رَبَّنَا لِيُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِكَ ۚ﴾ ’’پروردگار! اس لیے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں تیرے راستے سے!‘‘

ان کے پاس طاقت ہے‘ اقتدار ہے‘ اختیار ہے‘ دولت ہے‘ جاہ و حشم ہے۔ لوگ ان کے رعب و دبدبے کے خوف اور مال و دولت کے لالچ سے گمراہ ہو رہے ہیں۔ پروردگار! کیا تو نے انہیں یہ سب کچھ اس لیے دے رکھا ہے کہ وہ تیرے بندوں کو تیرے سیدھے راستے سے گمراہ کریں؟

﴿رَبَّنَا اطۡمِسۡ عَلٰۤى اَمۡوَالِهِمۡ وَاشۡدُدۡ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ﴾ ’’اے ہمارے رب! اب ان کے اموال کو برباد کر دے اور ان کے دلوں میں سختی پیدا کر دے‘‘

﴿فَلَا يُؤۡمِنُوۡا حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِيۡمَ﴾ ’’کہ یہ ایمان نہ لائیں جب تک کہ یہ کھلم کھلا دیکھ نہ لیں عذابِ الیم کو۔‘‘

اور جب وہ عذاب کو دیکھ لیں گے تو پھر ان کا ایمان انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا‘ کیونکہ اُس وقت کا ایمان اللہ کے ہاں معتبر نہیں ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آلِ فرعون سے بیزاری کی آخری حد ہے۔ اگرچہ نبی ایک ایک فرد کے لیے ایمان کا خواہش مند ہوتا ہے‘ مگر فرعون اور اس کے سردار اہل ایمان کو ستانے اور اذیتیں دینے میں اس حد تک آگے جا چکے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خود اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ! اب ان لوگوں کے دلوں کو سخت کر دے‘ ان کے دلوں پر مہریں لگا دے‘ تاکہ تیرا عذاب آنے تک انہیں ایمان نصیب ہی نہ ہو۔ اس لیے کہ جو کچھ انہوں نے اللہ اور اہل ایمان کی دشمنی میں کیا ہے اس کی سزا انہیں مل جائے۔

آیت ۸۹ ﴿قَالَ قَدۡ اُجِيۡبَتۡ دَّعۡوَتُكُمَا فَاسۡتَقِيۡمَا﴾ ’’اللہ نے فرمایا کہ (ٹھیک ہے) تم دونوں کی دُعا قبول کر لی گئی‘ اب تم دونوں بھی قائم رہو‘‘

ایسا نہ ہو کہ وقت آنے پر تمہارا دل پسیج جائے اور پھر دعا کرنے لگو کہ اے اللہ اب ان کو معاف فرما دے!

﴿وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيۡلَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ﴾ ’’اور ان لوگوں کے راستے کی پیروی مت کرنا جو علم نہیں رکھتے‘‘

آیت ۹۰ ﴿وَجٰوَزۡنَا بِبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ الۡبَحۡرَ﴾ ’’اور ہم نے بنی اسرائیل کو پار اتار دیا سمندر (یا دریا) کے‘‘

﴿فَاَتۡبَعَهُمۡ فِرۡعَوۡنُ وَجُنُوۡدُهٗ بَغۡيًا وَّعَدۡوًا ؕ﴾ ’’پھر ان کا پیچھا کیا فرعون اور اس

کے لشکروں نے سرکشی اور زیادتی کی غرض سے۔‘‘

﴿حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدۡرَکَہُ الۡغَرَقُ ۙ﴾ ’’یہاں تک کہ جب پالیا اُسے غرق نے‘‘

یعنی جب فرعون غرق ہونے لگا تو:

﴿قَالَ اٰمَنۡتُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِہٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَ اَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۹۰﴾﴾ ’’کہنے لگا کہ میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اُس کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں‘ اور میں (اُس کے) فرماں برداروں میں سے ہوں۔‘‘

آیت ۹۱ ﴿آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ وَ کُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۹۱﴾﴾ ’’کیا اب (تو ایمان لا رہا ہے)؟ حالانکہ اس سے پہلے تو نافرمانی کرتا رہا ہے اور تو فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔‘‘

آیت ۹۲ ﴿فَالۡیَوۡمَ نُنَجِّیۡکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوۡنَ لِمَنۡ خَلۡفَکَ اٰیَۃً ؕ﴾ ’’تو آج ہم تمہارے بدن کو بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے ایک نشانی بنا رہے۔‘‘

یعنی تمہارے جسم کو محفوظ رکھا جائے گا‘ اس کو گلنے سڑنے نہیں دیا جائے گا تاکہ بعد میں آنے والے اسے دیکھ کر عبرت حاصل کر سکیں۔ چنانچہ غرق ہونے کے کچھ عرصہ بعد فرعون کی لاش کنارے پر پائی گئی تھی‘ صرف اس کے ناک کو کسی مچھلی وغیرہ نے کاٹا تھا‘ باقی لاش صحیح سلامت تھی اور آج تک قاہرہ کے عجائب گھر میں موجود ہے۔

﴿وَ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ عَنۡ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوۡنَ ﴿۹۲﴾﴾ ’’اور یقیناً بہت سے لوگ ہماری آیات سے غفلت ہی برتتے رہتے ہیں۔‘‘

آیت ۹۳ ﴿وَ لَقَدۡ بَوَّاۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مُبَوَّاَ صِدۡقٍ وَّ رَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ﴾ ’’اور ہم نے بنی اسرائیل کو بہت ہی عمدہ جگہ فراہم کر دی اور ہم نے انہیں پاکیزہ روزی دی۔‘‘

﴿فَمَا اخۡتَلَفُوۡا حَتّٰی جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ ؕ﴾ ’’پھر انہوں نے اختلاف نہیں کیا یہاں تک کہ ان کے پاس علم آگیا۔‘‘

یعنی انہوں نے اُس وقت اختلاف کیا اور تفرقے برپا کیے جبکہ ان کے پاس علم آچکا تھا۔ انہوں نے ایسا ناواقفیت کی بنیاد پر مجبوراً نہیں کیا تھا‘ بلکہ یہ سب کچھ ان کے اپنے نفس کی شرارتوں کا نتیجہ تھا۔

﴿اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۹۳﴾﴾ ’’یقیناً آپ کا رب فیصلہ کرے گا ان کے مابین قیامت کے دن‘ جن چیزوں میں وہ اختلاف کرتے رہے تھے۔‘‘

آیات ۹۴ تا ۱۰۳

فَاِنۡ کُنۡتَ فِیۡ شَکٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ فَسۡـَٔلِ الَّذِیۡنَ یَقۡرَءُوۡنَ الۡکِتٰبَ مِنۡ
قَبۡلِکَ ۚ لَقَدۡ جَآءَکَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿ۙ۹۴﴾ وَ لَا
تَکُوۡنَنَّ مِنَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَتَکُوۡنَ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ
حَقَّتۡ عَلَیۡہِمۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿ۙ۹۶﴾ وَ لَوۡ جَآءَتۡہُمۡ کُلُّ اٰیَۃٍ حَتّٰی یَرَوُا
الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ ﴿۹۷﴾ فَلَوۡ لَا کَانَتۡ قَرۡیَۃٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَہَاۤ اِیۡمَانُہَاۤ اِلَّا قَوۡمَ
یُوۡنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوۡا کَشَفۡنَا عَنۡہُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡیِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ مَتَّعۡنٰہُمۡ
اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۹۸﴾ وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ کُلُّہُمۡ جَمِیۡعًا ؕ اَفَاَنۡتَ
تُکۡرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۹۹﴾ وَ مَا کَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تُؤۡمِنَ اِلَّا بِاِذۡنِ
اللّٰہِ ؕ وَ یَجۡعَلُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ قُلِ انۡظُرُوۡا مَاذَا فِی
السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَا تُغۡنِی الۡاٰیٰتُ وَ النُّذُرُ عَنۡ قَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾
فَہَلۡ یَنۡتَظِرُوۡنَ اِلَّا مِثۡلَ اَیَّامِ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ قُلۡ فَانۡتَظِرُوۡۤا
اِنِّیۡ مَعَکُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِیۡنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّیۡ رُسُلَنَا وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کَذٰلِکَ ۚ
حَقًّا عَلَیۡنَا نُنۡجِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۰۳﴾

آیت ۹۴ ﴿فَاِنۡ کُنۡتَ فِیۡ شَکٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ﴾ ’’پھر اگر آپ کو کوئی شک ہے اُس چیز کے بارے میں جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے‘‘

یہاں خطاب بظاہر محمد رسول اللہ ﷺ سے ہے‘ لیکن اس بات کا تو قطعاً کوئی امکان نہیں کہ آپ ﷺ کو اس میں کوئی شک ہوتا‘ لہٰذا اصل میں روئے سخن اہل مکہ کی طرف ہے۔ بعض اوقات جس سے بات کرنا مقصود ہوتا ہے اس کے رویے کی وجہ سے اس سے اس قدر نفرت ہو جاتی ہے کہ اسے براہِ راست مخاطب کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ ایسی صورت میں کسی دوسرے

شخص سے بات کی جاتی ہے تاکہ اصل مخاطب بالواسطہ طور پر اسے سن لے۔ چنانچہ اس کا مطلب یہی ہے کہ اے مشرکینِ مکہ! اگر تم لوگوں کو اس کتاب کے بارے میں کوئی شک ہے جو ہم نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کی ہے:

﴿فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾ ''تو پوچھ لیجیے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی آپؐ سے پہلے۔''

﴿لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٩٤﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کے پاس حق آیا ہے آپ کے رب کی طرف سے' تو ہرگز نہ ہو جائیں آپ شک کرنے والوں میں سے۔''

یہ اُسی اندازِ تخاطب کا تسلسل ہے کہ حضور ﷺ کو مخاطب کر کے مشرکین مکہ کو سنایا جا رہا ہے۔

آیت ۹۵ ﴿وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٩٥﴾﴾
''اور مت ہو جانا ان لوگوں میں سے جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا' ورنہ تم ہو جاؤ گے خسارہ پانے والوں میں سے۔''

آیت ۹۶ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٩٦﴾﴾ ''یقیناً جن لوگوں پر تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

جو لوگ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے قانونِ خداوندی کی زد میں آ چکے ہیں اور ان کے دلوں پر آخری مہر لگ چکی ہے' اب ایسے لوگوں کو ایمان نصیب نہیں ہو گا۔

آیت ۹۷ ﴿وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٩٧﴾﴾ ''اور چاہے ان کے پاس ساری ہی نشانیاں آ جائیں (اب وہ ایمان نہیں لائیں گے) جب تک کہ عذابِ الیم کو دیکھ نہ لیں۔''

جیسا کہ فرعون کا معاملہ ہوا کہ جب غرق ہونے لگا تب ایمان لایا۔

آیت ۹۸ ﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ﴾ ''تو کیوں نہ ہوئی کوئی بستی ایسی جو ایمان لاتی اور اُسے اُس کا ایمان نفع پہنچاتا سوائے قومِ یونسؑ کے؟''

حضرت یونس علیہ السلام نینوا کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ آپؑ کی دعوت کے مقابلے میں آپؑ کی قوم انکار پر اڑی رہی۔ جب آخری حجت کے بعد ان لوگوں پر عذاب کا فیصلہ ہو گیا تو

حضرت یونس علیہ السلام حمیت دینی کے جوش میں انہیں چھوڑ کر چلے گئے اور جاتے جاتے انہیں یہ خبر دے گئے کہ اب تین دن کے اندر اندر تم پر عذاب آ جائے گا' جبکہ اللہ کی طرف سے آپؑ کو اپنی قوم کو چھوڑ کر جانے کی ابھی باضابطہ طور پر اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ ایسے مواقع پر رسولؑ اپنی مرضی سے اپنی بستی کو نہیں چھوڑ سکتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے باقاعدہ ہجرت کا حکم نہ آ جائے (نبی کا معاملہ اس طرح سے نہیں ہوتا)۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دے دیا تھا مگر آپ ﷺ نے خود اس وقت تک ہجرت نہیں فرمائی جب تک آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے باضابطہ طور پر اس کی اجازت نہیں مل گئی تھی۔ سیرت کی کتابوں میں یہاں تک تفصیل ملتی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دو اونٹنیاں اس مقصد کے لیے تیار کر رکھی تھیں اور روزانہ آپؐ سے استفسار کرتے تھے کہ حضور! اجازت ملی یا نہیں؟

بہرحال حضرت یونس علیہ السلام کے جانے کے بعد جب عذاب کے آثار پیدا ہوئے تو پوری بستی کے لوگ اپنے بچوں' عورتوں اور مال مویشی کو لے کر باہر نکل آئے اور اللہ کے حضور گڑگڑا کر توبہ کی۔ اللہ کے قانون کے مطابق تو عذاب کے آثار ظاہر ہو جانے کے بعد نہ ایمان فائدہ مند ہوتا ہے اور نہ توبہ قبول کی جاتی ہے' مگر حضرت یونس علیہ السلام کے وقت سے پہلے ہجرت کر جانے کی وجہ سے اس قوم کے معاملے میں نرمی اختیار کی گئی اور ان کی توبہ قبول کرتے ہوئے ان پر سے عذاب کو ٹال دیا گیا۔ یوں انسانی تاریخ میں ایک استثناء (exception) قائم ہوا کہ اس قوم کے لیے قانونِ خداوندی میں رعایت دی گئی۔

﴿لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٩٨﴾﴾ ''جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ہٹا دیا اُن سے دنیا کی زندگی میں وہ رسوا کن عذاب اور ایک وقتِ معین کے لیے ہم نے انہیں (فوائدِ دنیوی سے) بہرہ مند ہونے کا موقع دے دیا۔''

آیت ۹۹ ﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) اگر آپ کا رب چاہتا تو زمین میں جتنے لوگ بھی ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔''

یہ مضمون سورۃ الانعام میں بڑے شد و مد کے ساتھ آ چکا ہے۔ حضور ﷺ کی شدید خواہش

تھی کہ یہ سب لوگ ایمان لے آئیں‘ مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں ہمارا اپنا قانون ہے اور وہ یہ کہ جو حق کا طالب ہوگا اسے حق مل جائے گا اور جو تعصب‘ ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آئے گا‘ اسے ہدایت نصیب نہیں ہوگی۔ اگر لوگوں کو مسلمان بنانا ہی مقصود ہوتا تو اللہ کے لیے یہ کون سا مشکل کام تھا۔ وہ سب کو پیدا ہی ایسے کرتا کہ سب مؤمن‘ متقی اور پرہیزگار ہوتے۔ آخر اس نے فرشتے بھی تو پیدا کیے ہیں جو کبھی غلطی کرتے ہیں نہ اس کی معصیت۔ جیسا کہ سورۃ التحریم میں فرمایا: ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝٦﴾ ’’وہ اللہ کے احکام کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے‘‘۔ لیکن انسانوں کو اُس نے پیدا ہی امتحان کے لیے کیا ہے۔ سورۃ الملک کے آغاز میں زندگی اور موت کی تخلیق کا یہی مقصد بتایا گیا ہے: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ﴾ (آیت ۲) ’’اُس نے زندگی اور موت کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون حسنِ عمل کا رویہ اختیار کرتا ہے‘‘۔ لہٰذا اے نبی (ﷺ) آپ اس معاملے میں اپنا فرض ادا کرتے جائیں‘ کوئی ایمان لائے یا نہ لائے اس کی پروا نہ کریں‘ کسی کو ہدایت دینے یا نہ دینے کا معاملہ ہم سے متعلق ہے۔

﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۹۹﴾ ’’تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کر دیں گے کہ وہ ضرور ایمان لے آئیں!‘‘

اصل میں یہ ساری باتیں حضور ﷺ کے دل مبارک کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کی جا رہی ہیں کہ آپ ؐ ہر وقت دعوت و تبلیغ کی جدّوجہد میں مصروف ہیں‘ پھر آپ ؐ کو یہ اندیشہ بھی رہتا ہے کہ کہیں اس ضمن میں میری طرف سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی۔ جیسے سورۃ الاعراف (آیت ۲ میں) فرمایا: ﴿فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ﴾ کہ آپ ﷺ کے دل میں فرائض رسالت کے سلسلے میں کسی قسم کی تنگی نہیں ہونی چاہیے۔ اور ان لوگوں کے پیچھے آپ ﷺ اپنے آپ کو ہلکان نہ کریں۔

آیت ۱۰۰ ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ ’’کسی جان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ ایمان لائے مگر اللہ کے اذن سے۔‘‘

﴿وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۰﴾ ’’اور وہ گندگی مسلط کر دیتا ہے اُن لوگوں پر جو عقل سے کام نہیں لیتے۔‘‘

آیت ۱۰۱ ﴿قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾ ’’ان سے کہیے کہ دیکھو جو

کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔‘‘

زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار نشانیاں ہیں‘ ان کو بنظر غائر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

﴿وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۱﴾ ’’لیکن یہ نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کے کچھ کام نہیں آتے جو ایمان نہیں لانا چاہتے۔‘‘

آیت ۱۰۲ ﴿فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ﴾ ’’تو کیا یہ منتظر ہیں اسی طرح کے دنوں کے جیسے ان سے پہلے لوگوں پر گزر چکے ہیں؟‘‘

رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں پر آنے والے عذابِ استیصال والے دنوں کو قرآن حکیم میں ’’ایام اللہ‘‘ قرار دیا گیا ہے۔ تو کیا یہ لوگ ایسے دنوں کے منتظر ہیں جو قومِ نوحؑ یا قومِ ہودؑ یا قومِ صالحؑ یا قومِ لوطؑ کو دیکھنے پڑے تھے؟

﴿قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝۱۰۲﴾ ’’کہہ دیجیے کہ پس انتظار کرو‘ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔‘‘

آیت ۱۰۳ ﴿ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰۳﴾ ’’پھر ہم نجات دیتے رہے ہیں اپنے رسولوںؑ کو اور اہل ایمان کو۔ اسی طرح ہمارے اوپر حق ہے کہ ہم اہلِ ایمان کو نجات دیں۔‘‘

جیسے حضرت نوح‘ حضرت ہود اور حضرت صالح ؑ کی قوموں میں سے جو لوگ ایمان لے آئے انہیں بچا لیا گیا۔ عامورہ اور سدوم کی بستیوں میں سے کوئی ایک خوش قسمت بھی نہ نکلا کہ اسے بچایا جاتا۔ حضرت لوط ؑ صرف اپنی دو بیٹیوں کو لے کر وہاں سے نکلے تھے‘ جبکہ ان کی اپنی بیوی بھی پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہ گئی اور عذاب کا نشانہ بنی۔

آیات ۱۰۴ تا ۱۰۹

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ښ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰۴ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۰۵
وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ

الظّٰلِمِیْنَ ﴿١٠٦﴾ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ
فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿١٠٧﴾
قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ
لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ﴿١٠٨﴾ وَاتَّبِعْ مَا
یُوْحٰٓی اِلَیْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰی یَحْكُمَ اللّٰهُ ۚۖ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿١٠٩﴾

آیت ۱۰۴ ﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ اے لوگو! اگر تمہیں میرے دین کے بارے میں کوئی شک ہے''

اب سورۃ کے آخر میں فیصلہ کن انداز میں خطاب کیا جا رہا ہے کہ اے لوگو! یہ جو تم مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہو' کہ میں اپنے موقف میں کچھ نرمی پیدا کر لوں یا تمہارے ساتھ کسی حد تک مداہنت (compromise) کا رویہ اختیار کروں' تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تمہیں میرے دین کے بارے میں ابھی تک شک ہے۔ اگر ایسا ہے تو تم لوگ اپنا یہ شک دور کر لو:

﴿فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ ۚ﴾ ''تو (جان لو کہ) میں ہرگز نہیں پوجنے والا اُن کو جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا' بلکہ میں تو پوجوں گا اُسی اللہ کو جو تمہیں قبض کرے گا۔''

﴿وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿١٠٤﴾﴾ ''اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں ایمان لانے والوں سے ہو جاؤں۔''

آیت ۱۰۵ ﴿وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ۚ﴾ ''اور یہ کہ آپؐ اپنا رخ سیدھا رکھیے دین کی طرف یکسو ہو کر۔''

پورے حنیف یعنی یکسو ہو کر دین کی طرف متوجہ ہوں۔

﴿وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿١٠٥﴾﴾ ''اور ہرگز نہ ہوں ان مشرکوں میں سے۔''

آیت ۱۰۶ ﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكَ وَلَا یَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿١٠٦﴾﴾ ''اور مت پکاریئے اللہ کے سوا اس کو جو نہ تمہیں نفع دے سکے نہ نقصان' اور اگر (بالفرض) آپؐ نے ایسا کیا تو پھر آپ بھی ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔''

آیت ۱۰۷ ﴿وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ﴾ ''اور اگر اللہ آپ کو کوئی ضرر پہنچائے' تو کوئی نہیں ہے اس کو دُور کرنے والا سوائے اللہ کے۔''

﴿وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ﴾ ''اور اگر وہ ارادہ کر لے آپؐ کے ساتھ بھلائی کا تو اُس کے فضل کو لوٹانے والا کوئی نہیں۔''

﴿یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿١٠٧﴾﴾ ''وہ پہنچاتا ہے اس (فضل) کو اپنے بندوں میں سے جسے چاہے' اور وہ بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔''

آیت ۱۰۸ ﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ﴾ ''کہہ دیجیے کہ اے لوگو! تمہارے پاس حق آ چکا ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ تو اب جو کوئی بھی ہدایت پائے گا وہ اپنے بھلے کو ہی ہدایت پائے گا۔''

اس ہدایت کا فائدہ اسی کو ہوگا' عاقبت اسی کی سنورے گی اور اللہ کی رحمت اس کے شامل حال ہوگی۔

﴿وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ﴿١٠٨﴾﴾ ''اور جو کوئی بھٹک جائے گا تو وہ بھی اپنی جان پر ہی وبال لے گا۔ اور میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں۔''

مجھے تمہارے اوپر کوئی داروغہ مقرر نہیں کیا گیا۔ میں تمہارے بارے میں مسئول نہیں ہوں۔ اللہ کے ہاں تمہارے بارے میں مجھ سے باز پرس نہیں ہوگی کہ یہ ایمان کیوں نہیں لائے تھے؟ ﴿وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ﴿١١٩﴾﴾ (البقرۃ) ''اور آپؐ سے نہیں پوچھا جائے گا جہنمیوں کے بارے میں!''

آیت ۱۰۹ ﴿وَاتَّبِعْ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْكَ وَاصْبِرْ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) آپؐ پیروی کرتے جایئے اُس کی جو آپ کی طرف وحی کیا جا رہا ہے اور صبر کیجیے''

اپنے موقف پر جمے رہیے اور ڈٹے رہیے' مشکلات کے دباؤ کو برداشت کیجیے۔

﴿حَتّٰی یَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿١٠٩﴾﴾ ''یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے' اور یقیناً وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔''

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم ونفعنى واياكم بالآيات والذِّكر الحكيم

مُذمّتِ بدعَت

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کا ۲۴/اگست ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ

(الحدید)

عَنْ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ اُمِّ عَبْدِ اللّٰهِ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :

((مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ))(۱) وَفِیْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ:

((مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ))(۲)

اُمّ المؤمنین اُمّ عبداللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’جو شخص ہمارے دین میں کسی ایسی بات کو جاری کرے جو اس دین میں نہیں ہے تو وہ بات (عمل) مردود ہے‘‘۔ مسلم کی روایت کے الفاظ یوں ہیں: ’’جو شخص ایسا عمل کرے جس کا ہمارے دین میں حکم نہیں تو وہ (عمل) مردود ہے۔‘‘

معزز سامعین کرام! امام نوویؒ کی مشہور کتاب ’’اربعین‘‘ کا ہم سلسلہ وار مطالعہ کر رہے ہیں۔ آج اس کتاب کی پانچویں حدیث زیر درس آئے گی۔ پچھلے تین خطاباتِ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الصلح‘ باب اذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح مردود۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الاقضیة‘ باب نقض الاحکام الباطلة ورد محدثات الامور۔

(۲) صحیح مسلم‘ کتاب الاقضیة‘ باب نقض الاحکام الباطلة ورد محدثات الامور۔

جمعہ میں ہم نے چوتھی حدیث کا تفصیل سے مطالعہ کیا تھا۔ اس ضمن میں ایک وضاحت مزید کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ اس حدیث میں بعض بہت ہی مشکل معاملات بیان ہوئے ہیں۔ اس حدیث کے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ ‘ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ‘ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ ‘ فَيَدْخُلُهَا ‘ وَاِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ‘ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ ‘ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ‘ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ ‘ فَيَدْخُلُهَا)) (۱)

’’تم میں سے کوئی آدمی اہلِ جنت کے سے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جنت کے مابین صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو اُس پر وہ سابقہ تحریر غالب آ جاتی ہے اور وہ شخص اہلِ جہنم کا سا عمل کر کے جہنم میں چلا جاتا ہے۔ اور ایک شخص اہلِ جہنم کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو وہ سابقہ تحریر اُس پر غالب آ جاتی ہے اور وہ شخص اہلِ جنت کا سا عمل کر کے جنت میں چلا جاتا ہے۔‘‘

اسی مضمون پر مشتمل ایک اور روایت ملاحظہ ہو جو حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ النَّارِ وَاِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ‘ وَيَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ النَّارِ ‘ وَاِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ)) (۲)

’’کوئی شخص جہنمیوں کے سے عمل کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ جنتی ہوتا ہے اور کوئی شخص اہل جنت کے سے اعمال کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ جہنمی ہوتا ہے — اور (یاد رکھو کہ) اعمال (اور فیصلہ) کا دار و مدار تو آخری وقت کے اعمال ہی پر ہے۔‘‘

اس طرح کا مفہوم رکھنے والی احادیث کا اخلاقی سبق (moral lesson) یہ ہے کہ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب احادیث الانبیاء‘ باب خلق آدم وذریته ۔ وصحیح مسلم‘ کتاب القدر‘ باب کیفیة خلق الادمی فی بطن امه وکتابة رزقه واجله۔

(۲) صحیح البخاری‘ کتاب القدر‘ باب العمل بالخواتیم۔

اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو نیکی کی توفیق دی ہوئی ہے تو اس پر کبھی بھی مغرور نہ ہوں اور نہ ہی یہ سمجھ بیٹھیں کہ میں تو جنتی ہوں‘ اور میرے لیے تو جنت لکھ دی گئی (reserved) ہے۔ کیا پتا زندگی کے باقی ایام میں کب کیا صورتِ حال پیش آ جائے۔ کب کوئی فتنہ سر اٹھائے اور آپ اس میں گر پڑیں۔ اور فتنے میں گرفتار انسان کے بارے میں کیا معلوم کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں تو یہاں تک الفاظ آئے ہیں:

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٨١﴾﴾ (البقرۃ)

"کیوں نہیں‘ جس شخص نے جان بوجھ کر کوئی (بڑا) گناہ کیا اور اس گناہ نے اس شخص کا احاطہ کر لیا پس یہی تو ہیں آگ والے‘ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

گویا اس کا انجام کافروں کا سا ہوگا‘ جن کے لیے ابدی جہنم ہے۔ دوسری طرف اگر آپ کو معلوم ہو کہ فلاں شخص بدکار ہے تو اس صورت میں آپ کو اس شخص کی بدی سے نفرت ہونی چاہیے نہ کہ اُس کی ذات سے۔ بلکہ آپ کو اس کی ہدایت کے لیے دعا گو ہونا چاہیے‘ اس لیے کہ یہ انبیاء و رسل کی سنت ہے کہ جو انہیں ایذا پہنچاتے تھے انبیاء ان کے بارے میں دعا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ "اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے دے‘ انہیں علم نہیں ہے"۔ الغرض یہ معاملہ دوطرفہ ہونا چاہیے کہ انسان کو کبھی اپنی نیکی پر غرہ نہ ہو اور وہ یہ نہ سمجھ لے کہ میں تو ہر حال میں جنتی ہوں۔ اس حوالے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک انتہائی بات ارشاد فرمائی کہ "اگر مجھے یہ بتا دیا جائے کہ تمام انسان جنت میں جائیں گے سوائے ایک آدمی کے تو مجھے یہ امید ہوگی کہ شاید وہ ایک آدمی میں ہی ہوں‘ اور اگر مجھے یہ بتا دیا جائے کہ تمام انسان جہنم میں جائیں گے سوائے ایک کے تو مجھے خوف رہے گا کہ شاید وہ ایک آدمی میں ہی ہوں"۔ اس کیفیت کو اصطلاح میں بین الخوف والرجاء کہتے ہیں۔ انسان کی اللہ کے ساتھ تعلق کی کیفیت ایسی ہی رہنی چاہیے۔ آپ اچھائی اور نیکی کے کتنے ہی اونچے مقام پر پہنچ گئے ہوں‘ اللہ کے خوف سے دل خالی نہیں رہنا چاہیے۔ اور ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِیْمِ)) جیسی احادیث ہمیشہ ذہن میں

رہنی چاہئیں‘ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں خاتمے کے وقت کی کیفیات کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا۔

حدیث کی تشریح

اب آیئے آج کی روایت کی طرف جس میں ایک بہت اہم مضمون بیان ہوا ہے۔ اس حدیث مبارکہ کی راویہ حضور اکرم ﷺ کی محبوب اہلیہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ آپؓ کا شمار اصحابِ علم اور فقہائے صحابہ میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے صحابہ اور تابعین پردے کے پیچھے سے آپ سے تعلیم حاصل کرتے تھے اور مسائل دریافت کرتے تھے۔ عورتوں کے مسائل اور حضور ﷺ کی ازدواجی زندگی کے متعلق معلومات کے حوالے سے آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ ازدواجی زندگی اگرچہ ایک پوشیدہ معاملہ ہے‘ لیکن وہ انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے جس کے بارے میں ہدایات بھی درکار ہیں۔ اس حوالے سے یہ نوٹ کر لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کی ازدواجی زندگی سے متعلق معلومات کا اکثر حصہ ہم تک ہماری ماں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پہنچایا ہے۔ ان چیزوں کی تعلیم کے حوالے سے غیر مسلم مسلمانوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے‘ جیسا کہ بعض صحابہؓ نے حضور اکرم ﷺ سے شکایت کی تھی کہ یہودی ہمارا مذاق اڑاتے ہیں کہ تمہارا نبی تو تمہیں بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ان سے کہو کہ ہاں ہمارا نبی تو ہمیں استنجا کرنا بھی سکھاتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے‘ اس لیے کہ طہارت ہی پر تو تمام عبادات کا دارومدار ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی "اربعینِ نووی" کی اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَھُوَ رَدٌّ))

"جس شخص نے ہمارے دین کے معاملے میں کوئی نئی بات ایجاد کی‘ جو اس دین میں پہلے نہیں ہے تو وہ بات (یا عمل) مردود ہے۔"

یہ تو بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت ہے‘ جبکہ ایک روایت امام مسلم کی روایت کردہ ہے:

((مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَیْسَ عَلَیْهِ اَمْرُنَا فَھُوَ رَدٌّ))

’’جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس کا ہمارے دین میں حکم نہیں تو وہ (عمل) مردود ہے۔‘‘

یہاں ترجمہ میں ان الفاظ کی گنجائش بھی موجود ہے کہ ’’وہ شخص مردود ہے۔‘‘

نبی اکرمﷺ کے خطبہ کے الفاظ

اس ضمن میں ایک اور حدیث آپ ہر خطبۂ جمعہ میں سنتے ہیں۔ یہ حدیث اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ نبی اکرمﷺ اپنے ہر خطبے میں یہ الفاظ ارشاد فرماتے تھے۔ اس کے راوی حضرت جابرؓ ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ ہر خطبے کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان فرماتے تھے۔

[اس حمد وثنا کے الفاظ بعض احادیث میں یوں مذکور ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ – اَمَّا بَعْدُ]

بعض احادیث میں دورانِ خطبہ یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: ((مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ)) ’’جس کو اللہ ہدایت دے دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا‘‘۔ ((اِنَّ اَصْدَقَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ)) ’’جان لو کہ سب سے سچی بات اللہ کی کتاب ہے‘‘ ((وَاَحْسَنَ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ ﷺ)) ’’اور بہترین ہدایت محمدﷺ کی ہدایت ہے‘‘ ((وَشَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا)) ’’اور (تمام معاملات میں) بدترین اعمال وہ ہیں جو نئے ایجاد کر لیے جائیں‘‘ ((وَکُلُّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ)) ’’اور ہر نئی چیز بدعت ہے‘‘۔ ((وَکُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ)) ’’اور ہر بدعت کھلم کھلا گمراہی ہے‘‘۔ ((وَکُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ))[1] ’’اور ہر گمراہی کا آخری ٹھکانہ جہنم ہے۔‘‘

(۱) سنن النسائی، کتاب صلاۃ العیدین، باب کیف الخطبۃ۔

لفظ بدعت کی تشریح

اس روایت میں دو الفاظ بہت اہم ہیں: بدعت اور محدَث۔ لفظ بدعت کا مادہ ’’بدع‘‘ ہے اور اس کے معنی ہیں: کسی چیز کا بالکل از سرِنو آغاز کرنا۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا: ﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (البقرۃ:۱۱۷) ’’وہ (اللہ) نیا پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا‘‘ —— شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو تمام مکاتب فکر مجموعی طور پر علومِ اسلامی کا مجدّد مانتے ہیں، البتہ جزوی طور پر بعض کو ان سے بُعد ہے۔ مثلاً ان کی بعض کتابوں کو اہلحدیث نظر انداز کرتے ہیں، اس لیے کہ ان میں تصوف کا بہت زیادہ ذکر ہے، جبکہ اہلِ تشیّع کو ان کی بعض کتابوں سے بہت دوری ہے، جیسے قرۃ العینین فی التفضیل الشیخین۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو تمام صحابہ میں جو فضیلت حاصل ہے اس پر شاہ ولی اللہؒ نے پوری کتاب لکھی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اہلِ تشیّع کو یہ کتاب پسند نہیں ہے۔ یہ چیزیں جزوی اعتبار سے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی تمام مکاتب فکر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ درحقیقت علوم اسلامی کے مجدّد اور قرآن مجید کی طرف لوگوں کو از سرِنو متوجہ کرنے والے شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں۔ ہندوستان میں حدیث کو متعارف (introduce) کرانے والے اگرچہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ہیں، لیکن اس اعتبار سے بھی جو خدمت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے سرانجام دی ہے وہ اپنی جگہ بہت اہم ہے —— شاہ ولی اللہ کی معرکۃ الآراء کتاب ’’حجۃ اللہ البالغہ‘‘ اسلامی فلسفے کے موضوع پر چوٹی کی کتاب ہے۔ اس کے پہلے باب میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال بنیادی طور پر تین قسم کے ہوتے ہیں: ابداع، خلق اور تدبیر۔ ابداع کے معنی ہیں کائنات کو بغیر کسی شے کے پیدا کرنا۔ اس کو انگریزی میں کہتے ہیں creation ex nehilo۔ خلق کے معنی ہیں ایک شے سے دوسری شے کو بنانا، مثلاً اللہ تعالیٰ نے آگ سے جن بنائے، مٹی اور پانی کے مجموعے سے حیوانات، بشمول انسان، بنائے۔ اس طرح کی تخلیق تو انسان بھی کرتا ہے کہ پہلے کوئی چیز نہیں تھی اس کو ایجاد کر لیا، جیسے بجلی، ہوائی جہاز وغیرہ پہلے نہیں تھے انسان نے ان کو ایجاد کر لیا۔ یہ ایک طرح سے انسان کی تخلیق

ہے۔اسی لیے سورۃ المؤمنون میں فرمایا:﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ ''پس کیا ہی بابرکت ہے اللہ تمام تخلیق کرنے والوں میں بہترین تخلیق کرنے والا!'' واضح رہے کہ یہاں ''خالقین'' جمع کا صیغہ آیا ہے۔لیکن ''بدیع'' یعنی ہر چیز کو از سرِنو پیدا کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا:﴿بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ﴾ ''وہ (اللہ) ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو از سرِنو پیدا کیا۔''

لفظ بدعت کی لغوی تشریح کے بعد اب بدعت کے شرعی اور اصطلاحی مفہوم کو سمجھ لیجیے۔عبادات کے ضمن میں ثواب کے حصول کے لیے کیے جانے والے کاموں میں کسی ایسی شے کا اضافہ کر دینا جو کتاب وسنت میں نہیں ہے بدعت کہلاتا ہے۔

اجتہاد اور سائنسی ایجادات بدعت نہیں!

یہاں یہ نوٹ کر لیں کہ سائنسی ایجادات اور اجتہاد بدعت نہیں ہیں۔اجتہاد بدعت سے بالکل الگ شے ہے کہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا جو پہلے نہیں تھا' اب قرآن وسنت کے محکمات اور نصوص سے انتہائی محنت سے اس کا حکم اخذ کرنا اجتہاد کہلاتا ہے۔مثلاً نبی اکرمﷺ نے فرمایا کہ تصویر بنانا حرام ہے۔حضورﷺ کے زمانے میں تصویر ہاتھ سے بنتی تھی' اس وقت کیمرے کا کوئی تصور نہیں تھا۔کیمرہ ایجاد ہوا تو یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ آیا کیمرے کی تصویر کا بھی ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر کا سا حکم ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہو گیا۔عالمِ عرب کے علماء کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ کیمرے کی تصویر پر ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر کی حرمت کا اطلاق نہیں ہوگا' اس لیے کہ یہ محض عکس ہے' جبکہ علمائے ہند کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر کی طرح کیمرہ کی تصویر بھی حرام ہے' البتہ کسی سماجی ضرورت کے تحت تصویر کھنچنا جائز ہے' مثلاً مجرموں کی شناخت' شناختی کارڈ' پاسپورٹ اور ویزہ وغیرہ کے لیے۔یہ اجتہاد چونکہ بدعت سے مختلف ہے اور بدعت کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی اس لیے اجتہاد کا شمار بدعت میں نہیں ہوگا۔

اسی طرح سائنسی ایجادات کا معاملہ ہے۔حضورﷺ کے زمانے میں سواری کا ذریعہ اونٹ' گھوڑے' خچر اور گدھے ہوتے تھے' ان کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں تھی۔

موجودہ دور میں ان کے علاوہ سائیکل' موٹر سائیکل' کار' بس اور ہوائی جہاز وغیرہ سفر کے ذرائع بن گئے ہیں۔تو اب ان کا استعمال بدعت نہیں ہے' اس لیے کہ ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے' یہ تو بس سائنسی ترقی (scientific development) ہے۔بعض لوگ بحث ومباحثہ میں کاروں اور بسوں میں سفر کو بھی بدعت کہہ دیتے ہیں' حالانکہ بدعت کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا' اس لیے کہ یہ نہ تو کسی عبادت کا حصہ ہیں اور نہ ان کا استعمال ثواب کی غرض سے کیا جاتا ہے۔البتہ اگر کسی اچھے مقصد مثلاً دین کی تبلیغ کے لیے سفر کیا جائے تو اس پر اجر وثواب ضرور ملے گا۔اس معاملے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ سفر ہوائی جہاز پر کیا گیا ہو' ٹرین پر' یا کار پر۔اور اگر کوئی شخص اونٹ پر بیٹھ کر برائی کی تبلیغ کرتا ہے تو اس کی پکڑ ضرور ہوگی' اس لیے کہ اصل چیز مقصد ہے نہ کہ سواری۔لہٰذا سائنسی ایجادات (scientific inventions) کا شمار بھی بدعت میں نہیں ہوگا' اس لیے کہ بدعت کے مفہوم کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا۔

لفظ محدَث کی تشریح

اس روایت میں دوسرا اہم لفظ محدَث ہے۔اس کا مادہ حدث ہے۔حَدَثَ کے معنی ہیں کوئی شے جو پہلے نہیں تھی وہ پیش آ گئی۔اس سے ایک لفظ حادثہ بن گیا جو اردو زبان میں بھی مستعمل ہے۔حادثہ کہتے ہیں کسی شے کا اچانک ہو جانا۔یعنی کچھ ایسا ہو جانا جو نہ پیش نظر تھا' نہ مقصد تھا نہ ارادہ تھا اور نہ ہی خواہش تھی۔اسی طرح کلام کے ذریعے سے ہم جو بات کہتے ہیں اس کو بھی حدیث کہا جاتا ہے' اس لیے کہ میرے کہنے سے پہلے وہ بات نہیں تھی' اب میں نے کہی تو وہ پیش آ گئی۔قرآن مجید کو بھی ''حدیث'' کہا گیا ہے:﴿فَبِاَىِّ حَدِيۡثٍۢ بَعۡدَهٗ يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۰﴾﴾ (المرسلٰت) ''تو اس حدیث (قرآن) کے بعد اب یہ کس شے پر ایمان لائیں گے؟'' حالانکہ اس سے زیادہ مبین' واضح اور ہدایت دینے والی شے تو کوئی اور ہے نہیں۔اس سے ایک لفظ محدث بنا ہے جس کے معنی ہیں ایسی چیز جو نئی ایجاد کر لی گئی ہو۔

بدعت کا سبب: عبادت اور عبادات میں فرق نہ کرنا

بدعات جنم لینے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اکثر لوگ عبادت اور عبادات کے تصور کو خلط ملط کر جاتے ہیں اور پھر اس سے معاملات الٹی سمت میں چلنے لگتے ہیں۔ عبادت اور عبادات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ عبادت تو ایک جامع لفظ ہے کہ پوری زندگی میں ہمہ وقت‘ ہمہ تن اور ہمہ وجوہ اللہ کی اطاعت محبتِ الٰہی کے جذبہ سے سرشار ہو کر کی جائے۔ یہ چونکہ بہت مشکل کام ہے اور اس میں بہت سی رکاوٹیں ہیں چنانچہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے چار عبادات نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ فرض کی ہیں۔ یہ چاروں عبادات دین کے ستون ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت بمنزلہ چھت کے ہے جو ان ستونوں کے سہارے کھڑی ہے۔ بغیر چھت کے ستونوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسی طرح ستونوں کے بغیر چھت بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ معلوم ہوا کہ عبادت اور عبادات لازم وملزوم ہیں‘ لیکن اگر عبادت اور عبادات میں ایک طرح کا مقابلہ شروع ہو جائے تو اس مقابلے سے عبادت کا جامع تصور اور اس کی ہمہ گیریت ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد عبادات پر زور بڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور یہ سارا معاملہ نیکی کے جذبے سے سرشار ہو کر اور پوری نیک نیتی کے ساتھ ہوتا ہے—— اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جب عبادت کا ہمہ گیر اور جامع تصور ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو اب نیکی کا جذبہ عبادات پر مرتکز ہو جاتا ہے۔ پھر ان عبادات میں غلو ہوتا ہے اور حد سے آگے بڑھنے کی ایک شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ اگر آپ ایک طشت میں پانی ڈالتے ہیں تو اس پانی کی اونچائی ایک یا دو انچ ہو گی اور اگر آپ اسی پانی کو کسی بوتل میں ڈال دیں تو اس کی اونچائی دس انچ ہو جائے گی۔ یہی معاملہ ہمارے دین کا ہے۔ جب عبادت کا ہمہ گیر اور وسیع تصور سکڑ کر عبادات میں آ گیا تو وہ تصور محدود ہو گیا۔ یقیناً اس سے عبادات میں غلو پیدا ہو گا‘ نئی نئی چیزیں اس میں شامل ہوں گی اور یہ پورے خلوص اور نیک نیتی سے ہو گا۔ اس تصور کو واضح کرنے کے لیے میں نے ابتدا میں سورۃ الحدید کی آیت ۲۷ تلاوت کی:

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ﴾

’’انہوں نے رہبانیت کی بدعت ایجاد کر لی تھی جس کا ہم نے ان کو حکم نہیں دیا تھا مگر (انہوں نے اپنے خیال میں) اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (خود ہی ایسا کر لیا) پھر جیسا اس کو نبھانے کا حق تھا ویسا نباہ نہ کر سکے۔‘‘

اس آیت کے آغاز میں ’’ابتدعوھا‘‘ آیا ہے۔ اس کا مادہ بھی بدع ہے‘ بابِ افتعال میں یہ ابتداع بن گیا۔

بدعت کی انتہا: رہبانیت

حضرت مسیح اور حضرت یحییٰ علیہما السلام انتہائی زاہد تھے اور دونوں کو دنیا سے کوئی لگاؤ نہ تھا‘ اس لیے دونوں نے شادی نہیں کی۔ لہٰذا ان کے متبعین‘ جو بہت خدا ترس تھے اور ان میں تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کا بہت غلبہ تھا‘ ان کے اندر بھی اس اعتبار سے غلو پیدا ہوا اور پھر اس سے انہوں نے رہبانیت کا نظام بنایا اور یہ عہد کیا کہ ساری عمر شادی نہیں کریں گے اور خانقاہوں میں پوری زندگی گزاریں گے۔ ابتدائی زمانے میں واقعتاً ایسے لوگ تھے جنہوں نے رہبانیت کا حق ادا کیا‘ لیکن اکثر و بیشتر لوگ اس کی پابندی نہیں کر پائے۔ انہوں نے رہبانیت کو اپنے اوپر لازم تو کر لیا اور یہ عہد کر لیا کہ اب شادی نہیں کریں گے لیکن اس کا پوری طرح حق ادا نہ کر سکے۔ اس کے بعد جب عیسائیوں میں خانقاہی نظام (monasticism) کا زوال آیا ہے تو پھر کہنے کو تو راہب خانے ہوتے تھے لیکن وہ برائیوں کی آماجگاہ بن چکے تھے۔ وہاں راہب مرد اور راہبہ عورتیں موجود ہوتی تھیں اور آپ کو معلوم ہے کہ کسی بھی جگہ عورت اور مرد کا قرب قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان راہب خانوں میں سب کچھ ہوتا تھا‘ زنا کاری ہوتی تھی‘ حرامی بچے پیدا ہوتے تھے اور پھر تہہ خانوں میں ان ناجائز بچوں کی قبریں بنتی تھیں۔ یہ باتیں فرضی نہیں ہیں بلکہ History of Christian Monasticism پر لکھی گئی کتابوں میں خود عیسائی مصنفین نے ان باتوں کا اعتراف کیا ہے۔ یہ تباہ کاریاں اس لیے ہوئیں کہ انہوں نے

فطرت کے تقاضوں کے خلاف غیر فطری قدغنیں لگا دیں۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک دریا زور وشور سے بہہ رہا ہے اور آپ اس کے آگے بند باندھیں تو دریا کا پانی اس بند کو فوراً بہا کر لے جائے گا۔ اسی طرح عیسائیت کے اس خانقاہی نظام کے ساتھ ہوا۔ چنانچہ اس آیت میں فرمایا گیا: ﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ ”پھر وہ اس کی پابندی بھی نہیں کر پائے' جیسے کہ پابندی کرنے کا حق تھا“۔ یہ دراصل **حکم الاکثر حکم الکُل** ہے۔ کچھ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں' اس لیے کہ بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے پوری عمر رہبانیت کے تقاضے پورے کیے' لیکن اکثریت اس کا حق ادا نہ کر سکی اور یہ اصول ہے کہ اکثریت کا جو معاملہ ہوگا اسی پر کل کا اطلاق ہوگا۔

آیت کے اگلے حصے میں فرمایا:

﴿فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٢٧﴾﴾

”پس جو لوگ ان میں سے صاحبِ ایمان تھے ہم نے انہیں اس کا اجر عطا کیا'
لیکن ان میں اکثر لوگ فاسق تھے۔“

آیت کے اس حصے کے دو ترجمے اور دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک مفہوم یہ ہے کہ عیسائیوں میں سے جو نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر ایمان لے آئے تو ان کو دوہرا اجر ملے گا۔ بعض احادیث میں بھی آیا ہے کہ اگر اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ میں سے کوئی حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔ اس لیے کہ وہ پہلے اپنے نبی کو مانتے تھے اور اپنی شریعت کے پابند تھے اور اب وہ محمد ﷺ کو مان رہے ہیں اور آپ ﷺ کی شریعت کے پابند ہو گئے ہیں۔ اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ان راہبوں میں سے جو لوگ واقعی صاحبِ ایمان تھے اور جنہوں نے اس عہد کی پابندی کی جو انہوں نے کر لیا تھا تو ہم ان کو ان کا اجر عطا کریں گے۔ اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ ان کی اکثریت فاسقوں اور غلط کار لوگوں پر مشتمل ہے' جنہوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا۔

نیک عیسائی راہب اور عالم عہدِ نبوی تک موجود تھے

یہ ایک حقیقت واقعی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں نیک راہب

آخری وقت تک موجود رہے ہیں۔ چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ بحیرہ راہب نے حضور ﷺ کو بچپن میں پہچان لیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ بچپن میں جب اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ تجارتی قافلے کے ساتھ شام گئے تھے تو راستے میں بحیرہ راہب نے آپ ﷺ کو پہچان کر آپ کے چچا ابوطالب سے کہا تھا کہ اس بچے کی حفاظت کرنا' یہودی اس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اسی طرح حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ' جن کا مقام اس درجے میں ہے کہ حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ سلمان تو ہمارے اہل بیت میں شامل ہے' ان کی راہنمائی کرنے والے دو عیسائی راہب ہی تھے۔ آپؓ تو ایران میں پیدا ہوئے تھے جہاں آگ کی پرستش ہوتی تھی' لیکن ان کی فطرت نے انہیں تلاشِ حق پر آمادہ کیا تو آپؓ نے اپنے دین کو اور اپنے وطن کو چھوڑا۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کو بھی ان کے باپ نے اپنے آباء واَجداد کا دین چھوڑنے کی پاداش میں گھر سے نکال دیا ہو۔ آپؓ نے شام آ کر عیسائیت اختیار کی' اس علاقے میں ایک نیک عیسائی راہب تھا' جس سے آپ نے علم حاصل کیا۔ جب اس راہب کا انتقال ہو رہا تھا تو آپؓ نے اس سے کہا کہ میرے علم کی پیاس کی ابھی تسکین نہیں ہوئی' میں اب کہاں جاؤں؟ اس نے ایک اور راہب کا پتا دیا۔ آپؓ وہاں پہنچ گئے اور اس سے علم حاصل کرنے لگے۔ جب اس کے انتقال کا وقت آیا تو آپ کے پوچھنے پر راہب نے بتایا کہ میرا علم بتا رہا ہے کہ جنوب کی جانب کھجوروں والی سرزمین میں نبی آخر الزماں ﷺ کا ظہور ہونے والا ہے۔ تم وہاں جاؤ' کیا عجب کہ اللہ تمہیں ان کے قدموں میں پہنچا دے۔ اس طرح ان دو نیک راہبوں کی بدولت حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو اپنی منزل ملی اور پھر آپ صحابیٔ رسول کے درجے پر فائز ہوئے۔

اسی طرح حضور ﷺ کے دور تک بہت سے عیسائیوں کے پاس علم کا وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ شاہِ حبشہ نجاشی نے جب سورۂ مریم کی آیات سنی تھیں تو اس نے کہا تھا کہ جو کچھ ان آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بیان کیا گیا ہے' حقیقت میں عیسیٰ (علیہ السلام) اس سے ایک تنکا برابر بھی زیادہ نہیں ہیں۔ اس سے نجاشی نے حضور ﷺ کو پہچانا۔ اسی طرح ہرقل نے بھی اپنے علم سے محمد ﷺ کو پہچانا۔ ابوسفیان جو ابھی مسلمان نہ

ہوئے تھے‘ تجارتی قافلہ لے کر گئے تو ہرقل‘ جس نے یہ سن رکھا تھا کہ عرب میں کسی نبی کا ظہور ہوا ہے اور وہ نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے‘ کو جب اس تجارتی قافلہ کا معلوم ہوا تو وہ یروشلم پہنچا اور وہاں جا کر ابوسفیان سے ایک طویل مکالمہ کیا۔ اس مکالمہ کے دوران اس نے ایک ایک کر کے ایسے سوالات کیے جیسے کوئی وکیل جرح کر کے حقیقت اندر سے برآمد کر لیتا ہے۔ یہ ایک طویل مکالمہ ہے جو سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ دورانِ مکالمہ بار بار میرا جی چاہا کہ میں جھوٹ بول کر محمد (ﷺ) کے خلاف بات کروں‘ لیکن مجھے خیال آیا کہ میرے ساتھ جو باقی عرب لوگ ہیں وہ کہیں گے کہ اتنا بڑا سردار جھوٹ بول رہا ہے! تو میں نے جھوٹ نہیں بولا اور ساری باتیں صحیح کہیں۔ مکالمہ کے اختتام پر ہرقل نے کہا کہ جو کچھ تم نے محمد (ﷺ) کے بارے میں کہا ہے اگر وہ صحیح ہے تو میرے قدموں کی زمین یعنی فلسطین اور شام پر اس نبی کا قبضہ ہو گا۔ الغرض حضور ﷺ کی بعثت تک چند نیک راہب بھی موجود تھے اور عیسائی عالمین بھی موجود تھے جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کو نشانیوں کے ذریعے پہچانا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اکثر و بیشتر نصاریٰ حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے محبت کرتے تھے اور ان کا اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں معاندانہ اور مخالفانہ ردعمل نہیں تھا۔ لیکن یہودی مسلمانوں کے سخت دشمن تھے اور اُس وقت یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی بڑی سخت دشمنی تھی۔ واضح رہے کہ سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۱ میں جو یہود و نصاریٰ کی آپس کی دوستی کی بات کی گئی ہے وہ ایک پیشین گوئی ہے جو آج کے دور کے بارے میں ہے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ﴾

”اے اہلِ ایمان! تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ۔ وہ تو ایک دوسرے کے دوست ہیں۔“

چند صحابہ کا عبادات میں غلو کا عہد اور نبی اکرم ﷺ کا اعلانِ براءت

بدعت کے سبب کے حوالے سے پہلی بات میں نے آپ کے سامنے یہ عرض کی کہ

جب عبادات کا تصور محدود ہو جائے تو سارا زور عبادات پر ہو جاتا ہے‘ پھر اس میں غلو پیدا ہوتا ہے اور نئی نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ اسی کے ضمن میں ایک اور حدیث میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہؓ کی ایک جماعت نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے حضور ﷺ کے گھریلو اعمال و عبادات کے بارے میں معلوم کیا‘ یعنی حضور ﷺ رات کو کتنی دیر جاگ کر نوافل پڑھتے ہیں اور کتنی دیر آرام فرماتے ہیں اور مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہیں اور کتنے دن افطار کرتے ہیں‘ وغیرہ۔ جب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے رسول اللہ ﷺ کے معمولات بتا دیے تو انہوں نے سوچا کہ یہ عبادات تو کم ہیں۔ ان کے خیال میں تھا کہ حضور ﷺ رات کو ایک لمحہ کے لیے بھی کمر بستر پر نہیں لگاتے ہوں گے اور آپؐ مسلسل روزے رکھتے ہوں گے‘ کبھی ناغہ نہیں کرتے ہوں گے۔ پھر انہوں نے اپنے آپ کو اطمینان دلانے کے لیے سوچا کہ یہ تو نبی اکرم ﷺ کا معاملہ ہے جو معصوم عن الخطا ہیں اور ان سے کوئی گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا‘ جبکہ ہم تو گناہگار ہیں‘ اس لیے یہ ہمارا معاملہ نہیں ہو سکتا۔ تو ان میں سے ایک نے کہا میں ساری رات آرام نہیں کروں گا بلکہ عبادت کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں ساری عمر شادی نہیں کروں گا۔ حضور اکرم ﷺ کو جب اس سارے معاملے کی خبر ہوئی تو آپؐ نے ان کو طلب کر کے انتہائی غیر معمولی الفاظ ارشاد فرمائے:

((اَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ‘ لٰكِنِّيْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّيْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ‘ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ)) (۱)

”یہ تم لوگ ہو جنہوں نے ایسی ایسی باتیں کی ہیں؟ اللہ کی قسم! میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں‘ لیکن میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں‘ اور (رات کو) نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں‘ اور میں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ پس جسے میری سنت پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔“

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب النکاح‘ باب الترغیب فی النکاح۔

یہی معاملہ ایک بہت مشہور صحابی کا ہوا۔ حضرت عمرو بن العاص ؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ ؓ بھی انتہائی زاہد اور عابد تھے۔ ان کے بارے میں آتا ہے کہ یہ ساری رات نوافل پڑھتے اور روزانہ روزہ رکھتے تھے۔ ان کو نہ بیوی سے کوئی سروکار تھا اور نہ دنیا کے کسی اور معاملے سے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو ان کے اس معمول کا پتا چلا تو آپؐ نے انہیں بلا کر پوچھا: ((یَا عَبْدَ اللّٰہِ اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّکَ تَصُوْمُ النَّھَارَ وَتَقُوْمُ اللَّیْلَ)) ''اے عبداللہ! مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم ہر روز روزہ رکھتے ہو اور پوری پوری رات (نفل میں) قیام کرتے ہو''۔ آپؓ نے عرض کیا: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ''ایسا ہی ہے یارسول اللہ!'' آپؐ نے فرمایا: ((فَلَا تَفْعَلْ)) ''پس ایسا ہرگز مت کرو'' ((صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ)) ''روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو' قیام بھی کرو اور نیند بھی کرو'' ((فَاِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا))(۱) ''اس لیے کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے' اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے' اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔''

بدعت کا دوسرا سبب: روحِ عبادت کا ختم ہو جانا

بدعات کا دوسرا بڑا سبب روحِ عبادت کا ختم ہو جانا ہے اور یہ نیک نیتی سے نہیں بلکہ جہالت اور غفلت کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہ یاد رکھیں کہ اگر عبادات میں سے روحِ عبادت نکل جائے تو عبادات کے ظاہر پر ارتکاز زیادہ ہو جاتا ہے اور پھر ظواہر میں اضافہ ہونا شروع ہوتا ہے' اور طرح طرح کی رسومات ایجاد ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی کے فوت ہونے کے بعد اس کو غسل دینا' کفن پہنانا' بہت احترام کے ساتھ کندھوں پر اٹھا کے قبرستان لے جانا' نماز جنازہ پڑھنا' اچھے طریقے سے دفن کرنا اور پھر آخر میں اس کی بخشش کے لیے دعا کرنا مسنون اعمال ہیں۔ اس کے بعد کوئی رسم نہیں' لیکن لوگ اس میں آگے سے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ پہلے ہم نے ہندوؤں سے ''تیجا'' لیا' پھر اس تیجے کو ''سوئم'' کا نام دے دیا۔ پھر اسے ''قل'' اور ''قرآن خوانی'' کے نام سے

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب لزوجک علیک حق۔

موسوم کر دیا۔ اس کے علاوہ ساتواں' دسواں' پھر چالیسواں اور پھر برسی جیسی رسومات ایجاد کر لیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ —— یہ کُل کی کُل بدعات ہیں۔

اس طرح شادی میں دعوت ولیمہ کے سوا باقی تمام دعوتیں اور رسومات اسراف اور تبذیر کے ذیل میں آتی ہیں۔ اس کے بارے میں فرمانِ باری تعالیٰ ملاحظہ ہو: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ۭ﴾ (الاسراء:۲۷) ''یہ مبذرین (دولت کو نمود و نمائش کے لیے اڑانے والے) شیطانوں کے بھائی ہیں''۔ اس ضمن میں حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی ایک حدیث ملاحظہ ہو۔ مجھے یہ حدیث بہت پسند ہے اور میں اکثر اسے اپنے خطبات میں بیان کرتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَہُ اللّٰہُ فِیْ اُمَّۃٍ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَہٗ مِنْ اُمَّتِہٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ)) ''اللہ نے جس نبی کو بھی اس کی قوم کی طرف بھیجا تو اس قوم میں اس نبی کے کچھ نہ کچھ حواری اور ساتھی ضرور ہوتے تھے''۔ اب یہ ساتھی تھوڑے ہوں یا زیادہ' ہوتے ضرور تھے' مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواری تھے' جبکہ نبی آخر الزماں ﷺ کے صحابہ کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ ان اصحاب کا معمول یہ تھا: ((یَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِہٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِہٖ)) ''وہ اپنے نبی کی سنت پر عمل پیرا ہوتے تھے اور ان کے احکامات بجا لاتے تھے''۔ ((ثُمَّ اِنَّھَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِھِمْ خُلُوْفٌ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ))(۱) ''پھر ہمیشہ یہ ہوتا رہا کہ ان اصحاب کے بعد ایسے ناخلف لوگ پیدا ہو گئے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا''۔ ہر نبی کے ماننے والوں میں ایسا ہوا ہے اور اُمتِ محمدؐ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے —— عید میلاد النبی کیا حضور ﷺ کا حکم ہے؟ کیا اس کا کوئی ثبوت صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے؟ کیا ہم ''میلاد النبی'' کی تقریبات منا کر یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہم صحابہ کرامؓ کے مقابلے میں حضور ﷺ سے زیادہ محبت کرتے ہیں؟ اصل بات وہی ہے جو اس حدیث میں بیان ہوئی کہ ہر نبی کے پیروکاروں میں کچھ عرصہ

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النھی عن المنکر عن الایمان......

گزرنے کے بعد ایسے لوگ آ جاتے ہیں جو کرتے وہ ہیں جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا۔ یہ ہے درحقیقت رسم پرستی اور پھر رسم کے اندر اضافہ ہوتے چلا جانا۔

بدعت کا نتیجہ: سنت کا خاتمہ

بدعت کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ جہاں بدعت آئے گی وہاں سنت رخصت ہو جائے گی۔ اب نماز جنازہ اور وفات کی رسومات کو لے لیجیے کہ نماز جنازہ کی اہمیت ان رسومات سے بھی کم ہو گئی ہے' بایں طور کہ نہ نماز جنازہ کا طریقہ سیکھنا ہے' نہ اس کی دعا یاد کرنی ہے' بس وہاں جا کر بت بن کر کھڑے ہو جانا ہے' چاہے وضو بھی ہو یا نہ ہو۔ لیکن قرآن خوانی اور ان باقی رسومات میں تو جانا ہی جانا ہے' اس میں تو کوئی دوسرا آپشن ہے ہی نہیں۔ حالانکہ میت کے حقوق میں سب سے بڑھ کر نماز جنازہ کی ادائیگی ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر نماز جنازہ کا طریقہ آنا چاہیے' دعا یاد ہونی چاہیے اور اس دعا کا ترجمہ بھی یاد ہونا چاہیے تاکہ دل سے دعا مانگ سکیں۔ الغرض یہ بات یاد رکھیں کہ بدعت کے آنے سے سنت کی حیثیت کم ہو جائے گی اور آہستہ آہستہ سنت بالکل غائب ہو جائے گی۔ یہ بدعت کا بدترین نتیجہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بدعات اور محدثات سے بچائے اور اعتصام بالکتاب والسنۃ کی توفیق عطا فرمائے۔ احادیث کی کتابوں میں ''اعتصام بالکتاب والسنۃ'' کے پورے پورے باب ہیں۔ لہٰذا کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اللہ کی کتاب اور سُنّتِ رسول ﷺ کو مضبوطی سے تھامیں' عبادات کے اندر روحِ عبادت اور خشوع وخضوع اور تواضع پیدا کریں اور پھر عبادات کے ساتھ عبادت کے اصل تصور کو محو نہ ہونے دیں۔

(جاری ہے)

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(مرتب: حافظ محمد زاہد' ادارتی معاون)

سورۃ الفاتحہ کی تفسیر

انواعِ توحید کے نقطہ نظر سے

حافظ محمد مشتاق ربانی

کلمۂ توحید ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کا قائل ہونا بڑے نصیب کی بات ہے۔ یہ ایک ایسا کلمہ ہے جس کا پھیلاؤ پوری زندگی پر ہے۔ اس کلمہ کے دو جزو ہیں: ایک ''لَا اِلٰهَ'' اور دوسرا ''اِلَّا اللّٰهُ''۔ پہلا جزو نفی کا ہے اور دوسرا اثبات یعنی توحید کا۔ یہ کلمہ ہمیں یہ بات سکھاتا ہے کہ ہمیں جس قدر شرک سے نفرت اور بیزاری ہو اسی قدر اللہ سے محبت ہو۔

توحید سے انسان کو وہ اطمینان اور سکون ملتا ہے جو کسی اور چیز میں نہیں۔ توحید کو ہم نے ایک جامد عقیدہ بنا دیا ہے' حالانکہ یہ ایک متحرک عامل ہے جو انسان کو قوت اور طاقت فراہم کرتا ہے۔ یہ قرآن حکیم کا مرکزی مضمون ہے اور ہر سورت میں اس کا مفصّل ذکر ہے۔ مفسّرین نے سورۃ الفاتحہ کی اپنے اپنے ذوق کے مطابق تفسیر بیان کی ہے جو نہایت عمدہ ہے۔ آئندہ بھی اس میں مزید گنجائش باقی رہے گی۔ یہاں اس تحریر میں سورۃ الفاتحہ کے بارے میں ایک خاص زاویہ سے بات کی جا رہی ہے۔ اس مختصر اور جامع سورت میں توحید اور اس کی انواع بڑے واضح اسلوب میں بیان ہوئی ہیں' جنہیں بعض مفسّرین کرام نے ذکر بھی کیا ہے' لیکن ہمارے ہاں عام طور پر اس کو صرف دعا تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک جامع دعا بھی ہے' لیکن اس کو اور پہلوؤں سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس تحریر میں اس سورت کا توحید کے حوالے سے جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس لیے بہتر دکھائی دیتا ہے کہ پہلے ہم توحید کی انواع تازہ کر لیں' پھر ہم دیکھیں کہ اس سورت میں کہاں کہاں توحید اور اس کی اقسام بیان ہوئی ہیں۔ علماء عقیدہ نے توحید کی تین اقسام بیان کی ہیں' جو دراصل علم الاصول کا درجہ رکھتی ہیں:

(۱) **توحید الرّبوبیة** (۲) **توحید الألوهية** (۳) **توحید الأسماء وَالصِّفات**

توحید الربوبیة: اللہ تعالیٰ کو اس کے افعال میں اکیلا ماننا۔ جیسے خلقت' بادشاہی' رزق کی

فراہمی' موت اور زندگی' کائنات کے اُمور کی تدبیر وغیرہ۔ یہ سب کام اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ ان امور کے سلسلے میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ تمام کام وہ تنہا کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر بیان ہوا ہے کہ مشرکینِ مکّہ سے جب پوچھا جاتا کہ تمہارا خالق کون ہے؟ تمہیں رزق کون دیتا ہے؟ کائنات کی تدبیر کون کرتا ہے؟ تو وہ بلا تامل کہتے کہ اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿قُلۡ لِّمَنِ الۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِیۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۴﴾ سَیَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ ؕ قُلۡ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۸۵﴾﴾ (المؤمنون)

''ان سے کہو' بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ کی! کہو' پھر تم ہوش میں کیوں نہیں آتے؟''

اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ میں دراصل تنبیہہ ہے کہ تم مختلف امور میں اُس کے مالک ہونے کا اقرار کر رہے ہو تو عملی زندگی میں اس کی اطاعت تسلیم کرو' اُس کی حاکمیت کو چیلنج نہ کرو۔ اپنی انفرادی زندگی میں بھی اس کو حاکم مانو اور اجتماعی زندگی میں بھی اس کے دیے ہوئے قوانین ہی کو حرفِ آخر سمجھو۔ اگر تم سمجھ رہے ہو کہ وہی کائنات کا مدبر ہے تو پھر اپنی روزمرہ کی زندگی میں اُسی کو حاکم مطلق مانو تاکہ تمہارا نظامِ زندگی بغیر کسی خلل کے چل سکے۔

توحید الألوهية: اکیلے اللہ کو عبادت کا حق دار سمجھنا۔ اس میں ہر نوع کی عبادت شامل ہے' چاہے قولی عبادت ہو' قلوب کے اعمال ہوں' یا عملی عبادت ہو۔ جیسے صلاۃ' استغاثہ' استعانت' توکل' رجاء' دعا کرنا' نذر ماننا وغیرہ۔ ان تمام امور میں لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ سے تعلق رکھیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ توحید کی اسی نوع میں لوگ زیادہ تر شرک میں مبتلا رہتے ہیں۔ توحید کی اس نوع سے تعلق رکھنے والی عبادت کی قبولیت کی دو شرائط ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں اخلاص ہو اور دوسرا عنصر یہ ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے طریقے پر ہو۔ توحید کی اس نوع کے بارے میں واضح رہے کہ جس طرح ہم مان رہے ہیں کہ صلاۃ اور دیگر عبادات صرف اللہ کا حق ہیں اسی طرح ہم اپنی اجتماعی زندگی میں اُس کو مقتدرِ اعلیٰ مانیں' اُس کی توحید قائم ہوتی دکھائی دے' ہر نزاع میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اتھارٹی نظر آئے۔ پھر توحید الوہیت کے ثمرات سوسائٹی کو حاصل ہوں گے اور اس کے مثبت اثرات فرد تک بھی پہنچیں گے۔

توحید الأسماء وَالصِّفات: جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات میں کوئی شریک نہیں ہے اُسی

طرح اُس کی صفات میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وہ اَسماء وصفات جو اُس نے اپنے بارے میں بتائے ہیں یا جن کے بارے میں آنحضورﷺ نے ہمیں آگاہ کیا ہے ان میں وہ تنہا ہے۔ اس کی ذات وصفات کی نہ کوئی مثال ہے‘ نہ تشبیہ اور نہ ہی کوئی نظیر۔ وہ مخلوق کی مشابہت سے بالکل پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کو بغیر کسی تمثیل اور بلا کیف ماننا لازم ہے۔ ان اسماء وصفات کی کوئی تاویل کرنی جائز نہیں ہے۔ ارشاد ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ﴾ (الشوریٰ:۱۱) ”اُس کے مانند کوئی شے بھی نہیں ہے۔“ بعض مفسرین کرام کا کہنا ہے کہ مثل یہاں صفت کے مفہوم میں ہے۔ اس کی صفات کی مانند کسی کی صفات نہیں ہیں۔ اللہ کی صفات کی کیفیت کوئی نہیں جان سکتا۔ ارشاد ہے: ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ۝۱۱۰﴾ (طٰہٰ) ”اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔“ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھوں کا ذکر ہے: ﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ (المائدۃ:٦٤) ”بلکہ اُس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔“ اللہ کے دو ہاتھوں کی تاویل کرنے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اس کے ہاتھ کیسے ہیں۔ ہم اللہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں پر محمول نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ہاتھوں کی کنہ تک ہم نہیں پہنچ سکتے۔ (وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا)

سورۃ الفاتحہ میں توحید کا بیان

سورۃ الفاتحہ کے کئی نام ہیں۔ ان ناموں میں سے اُمّ القرآن اور القرآن العظیم بھی ہیں۔ یہ نام اس لیے دیے گئے ہیں کہ اس میں قرآن مجید کے سبھی موضوعات کا ذکر ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور اُس کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ اس میں اس کی عبادت‘ اور عبادت میں اخلاص پیدا کرنے کا ذکر ہے۔ اس کی مدد کا محتاج ہونے کا بیان ہے‘ کہ اس کی اعانت کے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح صراطِ مستقیم کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی راہنمائی کر سکتا ہے۔ اگر اس کی راہنمائی شاملِ حال نہ ہو تو پھر انسان گمراہی کا شکار ہو جائے گا۔ گویا اس سورت کے بیشتر امور توحید سے متعلق ہیں۔ امام قرطبی سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں: الفاتحة تضمنت التوحيد والعبادة والوعظ والتذكير۔ ”سورۃ الفاتحہ توحید‘ عبادت‘ وعظ ونصیحت اور یاددہانی کے مضامین پر مشتمل ہے“۔ عبدالرحمٰن السعدی نے اپنی تفسیر ”تیسیر الکریم الرحمٰن فی کلام المنان“ میں سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کے اختتام پر اشارۃً بیان کیا ہے کہ اس سورت میں توحید کی انواع کن کن کلمات میں بیان ہوئی ہیں۔ اب آیئے

دیکھتے ہیں کہ اس سورت میں توحید اور اس کی انواع کیسے بیان ہوئی ہیں۔ اس طور سے سمجھنے کے بعد تلاوت کرنے والوں کے لیے یہ سورت اور ہی اثرات مرتّب کرے گی۔

○ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ** : یہ نہایت جامع کلمہ توحید ہے۔ اس سورت کے علاوہ چار اور سورتیں ہیں جو حمد باری تعالیٰ سے شروع ہوتی ہیں۔ حمد اور مدح کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے۔ **الحمد:** حمد میں توحید الوہیت ہے اور اس میں مدح وثنا کے ساتھ ساتھ شکر کرنے کا بھی عنصر ہے۔ اس حمد کا اظہار جہاں زبان سے ہوتا ہے وہیں عبادت کی شکل میں جوارح سے بھی ادا ہوتا ہے۔ **اللّٰہ:** اسی اسم جلالہ سے توحید الوہیت ماخوذ ہے۔ اس اسم کے بارے میں لغویین میں بڑی بحثیں ہیں کہ لفظ اللہ کا اصل کیا ہے۔ البتہ ایک بات واضح ہے کہ یہ الٰہ اور معبود کے مفہوم میں ہے۔ اسم ”اللّٰہ“ ایک جامع لفظ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے اوصاف جمع ہو جاتے ہیں۔

علمائے کرام کے مابین اختلاف ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں سے کون سا کلمہ زیادہ افضل ہے۔ علماء کرام کا ایک گروہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کو افضل سمجھتا ہے‘ کیونکہ اس میں توحید وحمد دونوں ہیں اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں توحید ہے۔

○ **رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ‘ رب** : اسم رب سے ہی توحید ربوبیت اخذ ہے۔ رب دراصل مالک کے معنی میں ہے‘ جیسے عربی میں گھر اور اونٹنی کے مالک کو رَبُّ الدَّارِ اور رَبُّ النَّاقَةِ کہتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کے قصہ میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِرْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ﴾ (یوسف:۵۰) ”اپنے آقا کے پاس جاؤ“۔ رب کا معنی آگے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں آ گیا ہے کہ وہ مالک ہے‘ اس کی بالادستی کو تسلیم کیا جائے۔ بعض لغویین لفظ رب کو تربیۃ سے لیتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مفہوم ہو گا کہ وہ تمام کائنات کی حوائج کا خیال رکھتا ہے۔ **اَلْعٰلَمِيْنَ**: اس میں کل کائنات شامل ہے۔ کائنات میں دو ہی وجود ہیں‘ ایک خالق اور دوسرا مخلوق۔ خالق اللہ کی ذات ہے اور اس کے سوا سب مخلوق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ سے کائنات کے خالق کے وجود کا اظہار ہو رہا ہے اور یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کی محتاج ہے۔

○ **اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ**: اَلرَّحْمٰن: یہ فعلان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کی رحمت دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں ہے۔ اَلرَّحِيْمُ: یہ فعیل کے وزن پر ہے جس میں دوام پایا جاتا ہے۔ یعنی وہ ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ : اللہ تعالیٰ کے دو صفاتی نام ہیں جن سے بالکل واضح ہے کہ ان میں

توحید الاسماء والصفات کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان جیسی صفات سے انسان کو حوصلہ ملتا ہے اور اس کی ڈھارس بندھتی ہے۔ وہ مایوس ہونے سے بچتا ہے۔ اللہ کی رحمت کا پہلو ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ یہاں ضمنی طور پر یاد رکھیں کہ بسملہ میں بھی توحید کا ذکر ہے۔ بسملہ میں اسم اللہ کے علاوہ اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کا ذکر ہے۔ اہل علم کے ایک طبقہ کے ہاں بسملہ سورۃ الفاتحہ کا جزو ہے۔ ان کے نزدیک اس کو شامل کرنے سے سورۃ الفاتحہ کی سات آیات ہوتی ہیں اور صِرَاطَ الَّذِیۡنَ سے لے کر وَلَا الضَّآلِّیۡنَ تک ساتویں اور آخری آیت ہے۔ جبکہ ایک دوسرا طبقہ جو بسملہ کو سورۃ الفاتحہ کا حصہ نہیں سمجھتا ہے ان کے نزدیک صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ چھٹی آیت ہے اور غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ ساتویں آیت ہے۔ بہرحال یہ ایک الگ موضوع ہے۔ یہاں صرف اس حد تک بات کی جا رہی ہے کہ بسم اللہ میں توحید الوہیت اور اَلرَّحۡمٰنُ الرَّحِیۡمُ میں توحید الاَسماء والصفات کا ذکر ہے۔

○ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ : اس آیت میں توحید ربوبیت ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے روزِ جزا وسزا کے مالک ہونے کا ذکر ہے۔ مٰلِكِ: یعنی وہ ذات جو صفت بادشاہت سے متّصف ہو۔ وہ حکم کرنے اور منع کرنے کا اختیار رکھتا ہو اور جو اس کا حکم نہ مانے اس کو سزا دینے کا اس کو اختیار ہو۔ آخرت میں سب جن وانس اس کو مالک ماننے پر مجبور ہوں گے۔ آخرت میں صدا لگے گی: ﴿لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ ؕ﴾ ''آج کے دن کس کی بادشاہی ہے؟ جواب ملے گا: ﴿لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ ﴿۱۶﴾﴾ (المؤمن) ''اللہ اکیلے زبردست کی''۔ اس میں کچھ شک نہیں دنیا میں بھی وہی مالک ہے۔ لیکن بعض انسان اپنی سرکشی کی وجہ سے اللہ کو اس کا یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ آخرت میں اس کی صفت ملکیۃ کا پوری شان وجلال کے ساتھ ظہور ہو گا۔

○ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ : اس آیت میں توحید الوہیت کا بیان ہے۔ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ اس میں مفعول اِیَّاکَ مقدم ہے جو حصر کا فائدہ دے رہا ہے' جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اَلۡعِبَادَۃ: انتہا درجے کے خضوع کو عبادت کہتے ہیں۔ عبادت میں اطاعت بھی شامل ہے' کیوں کہ عبادت کو مراسم عبودیت تک محدود نہیں کیا جا سکتا' بلکہ زندگی کے تمام امور اس میں شامل ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو میں اللہ تعالیٰ کے آگے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ اس عبادت کا حقدار صرف اللہ کی ذات ہے اور اللہ کی عبادت کا بنیادی عنصر توحید ہے۔ اس توحید کی وضاحت کا روشن پہلو یہی ہے کہ ہم اللہ کے حکم کے سامنے ہر پارلیمنٹ اور عدالت کو ہیچ

سمجھیں۔ اللہ کی حاکمیتِ اعلیٰ کا نفاذ نظر آئے۔

وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ: اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ ہر مشکل میں تیرا ہی سہارا تلاش کرتے ہیں۔ اس میں اللہ کے سامنے عجز وانکساری کا اظہار ہے۔ اللہ سے استعانت تو ہر چیز میں مانگنی چاہیے چاہے چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا' لیکن اس کے بعد ہدایت کے لیے دعا کی جا رہی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ انسان سیدھے راستے کی ہدایت کے لیے خصوصاً اللہ کی مدد کا محتاج ہے۔ سیدھا راستہ دکھائی دینے کے بعد تمام امور درست ہو جائیں گے۔

اس آیت میں توحید الوہیت بڑے واشگاف الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں مشہور مفسّر تابعی ضحاکؒ اور ابن عباسؓ سے اس آیت کا یہ مفہوم نقل کیا گیا ہے: اياك نوحد ونخاف ونرجوك يا ربنا ولا غيرك ''اے ہمارے رب! ہم تیری ہی توحید کا اظہار کرتے ہیں' تجھ ہی سے ڈرتے ہیں اور تجھ ہی سے اُمید لگائے بیٹھے ہیں۔ تیرے سوا ہم نہ کسی کی عبادت کرتے ہیں اور نہ ہی مدد مانگتے ہیں''۔ اس آیت کے بارے میں ابن کثیرؒ بیان کرتے ہیں: الأول تبرؤ من الشرك والثانی تبرؤ من الحول والقوة والتفويض الى الله۔ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ میں شرک سے بیزاری کا اظہار ہے اور وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے پاس طاقت ہونے کی نفی ہے اور اس میں سارے کاموں کو اللہ کے سپرد کرنے کا بیان ہے۔

○ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ : اس میں توحید الوہیت ہے کیوں کہ دعا کرنا توحید الوہیت کا ایک جزو ہے اور دعا بھی دراصل عبادت ہے۔ حدیث نبوی ہے: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الۡعِبَادَةِ)) ''دعا عبادت کا مغز ہے'' اور ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الۡعِبَادَةُ)) ''دعا ہی اصل عبادت ہے۔'' لہٰذا اللہ ہی سے دُعا کرنی چاہیے' کسی اور سے دعا کرنا شرک ہے۔

اَلصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ : کے کئی مطالب بیان کیے گئے ہیں' لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ صراط مستقیم توحید کا راستہ ہے۔ اس مفہوم میں تمام معانی سمو جاتے ہیں۔ اگر ہم صراط مستقیم سے توحید مراد لیتے ہیں تو ایک اشکال ابھرتا ہے کہ دعا کرنے والا پہلے سے ہی توحید پر گامزن ہے تو پھر دعا اس چیز کے لیے کیوں کی جا رہی ہے جو پہلے سے حاصل ہے؟ اس ضمن میں واضح رہے کہ اِهۡدِنَا کے کئی وجوہ ہیں۔ اس کے معنی ہدایت پر ثابت قدم رہنے کے ہیں۔ اس کا مفہوم زیادہ ہدایت طلب کرنے کا بھی ہے۔ پھر اس کے معنی ثواب (بدلہ) بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کر رہے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں تو اس کے بدلے میں اے

ہمارے رب ہمیں سیدھا راستہ دکھا دے۔ اِهْدِنَا میں اس مفہوم کا بھی امکان ہے کہ جس طرح ہم ماضی اور اب حال میں صراطِ مستقیم پر ہیں مستقبل میں بھی ہمیں اسی راستے پر گامزن رکھنا۔

○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ: جن لوگوں کے راستے پر چلنے کے لیے دعا کی جا رہی ہے وہ اہلِ توحید تھے' جیسے انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ آنجناب ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴿۵۲﴾﴾ (الشورٰی) ''اور یقیناً آپ ﷺ سیدھے راستے کی جانب رہنمائی کرتے ہیں''۔ ان انعام یافتہ لوگوں کے برعکس جو مغضوب اور الضالین ہیں وہ حقیقت میں اہلِ شرک ہیں۔

○ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ: مفسرین کرام نے عموماً ''مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' سے مراد یہود اور ''اَلضَّآلِّيْنَ'' سے مراد نصاریٰ لیے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کو ان القابات سے پکارے جانے کی جو بھی وجہ ہے وہ اپنی جگہ پر ہے' لیکن یہ دونوں مذہبی گروہ شرک فی الذات کی انتہا تک پہنچے ہیں۔ حیرت ہے کہ یہ دونوں الہامی مذاہب ہیں' پھر بھی شرک فی الذات تک پہنچ جانا ایک غیر معمولی بات ہے جو امت مسلمہ کے لیے عبرت کا مقام ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اُمت مسلمہ کے بعض افراد آنحضور ﷺ اور امت کے صلحاء کو عقیدت میں اس حد تک لے جائیں کہ انہیں مخلوق کی صف سے ہی نکال دیں۔ اور ایسا طرزِ عمل کئی حضرات کی طرف سے سامنے بھی آیا ہے۔ انہیں چاہیے کہ شرک کے اندھیروں سے نکلیں' توحید کی روشنی کی طرف بڑھیں اور دین میں غلو نہ کریں۔

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 15 روپے

'حق' اپنے مفہوم کے آئینہ میں

عتیق الرحمٰن صدیقی ☆

'حق' ایک نہایت معروف' معلوم اور بالعموم استعمال کیا جانے والا لفظ ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ سوا دو سو سے زائد بار استعمال ہوا ہے' اس کے مشتقات اس پر مستزاد ہیں۔ یہ لفظ باطل کا متضاد ہے۔ تحقیق کے بعد جس چیز میں ثبات اور پائیداری نظر نہ آئے اسے باطل کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ﴾ (لقمٰن: ۳۰) ''یہ اس لیے کہ اللہ کی ذات برحق ہے اور جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ لغو ہیں''۔ اس لفظ کا اطلاق قول و فعل دونوں پر ہوتا ہے۔ چنانچہ کتاب حکیم میں فرمایا گیا: ﴿لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ (آل عمران: ۷۱) ''تم جھوٹ کو سچ کے ساتھ کیوں خلط ملط کرتے ہو؟''

صحیح اور سچی' عدل و انصاف اور حقیقت کے مطابق بات' اس کا تعلق دُنیوی امور سے ہو یا عقیدہ و ایمان سے' وہ وابستہ اور مربوط ہو' حق کہلاتی ہے۔ اس سے مراد وہ حق بھی ہے جس کا ادا کرنا انسان پر وجوب کا درجہ رکھتا ہو' وہ اس کے خالق و مالک کا حق ہو یا بندگانِ خدا سے اس کا تعلق ہو' یا خود اس کے نفس کا اس پر حق ہو۔ سورۃ العصر میں واضح انداز میں فرما دیا گیا:

﴿وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝٢ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣﴾ (العصر)

''زمانے کی قسم' انسان درحقیقت خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

حق کی نصیحت کرنے میں کوئی ابہام نہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کا معاشرہ باطل سے رزم آرا رہے' بے حسی کا شکار ہو کر نرا تماشائی نہ بنا رہے' بلکہ جہاں اور جس

☆ ریٹائرڈ پرنسپل۔ ہری پور

شکل میں باطل نمودار ہو رہا ہو اس کی سرکوبی کرنے اور کلمۂ حق کی صدا بلند کرنے کے لیے مستعد اور تیار رہے۔ ایک بندۂ مؤمن خود بھی حق پرستی' راست بازی اور عدل و انصاف کے موقف پر قائم ہو اور دوسروں کو بھی اس عمل کی واضح تلقین کرے تاکہ معاشرہ اخلاقی زوال و انتشار میں مبتلا ہونے سے بچا رہے۔ اگر حق کے پامال ہونے پر وہ ساکت و صامت رہے گا' اس کا ماتھا شکن آلود نہ ہو گا اور وہ پیچ و تاب کھا کر حق کی نصرت و حمایت نہیں کرے گا تو اسے کوئی خائب و خاسر ہونے سے نہیں بچا سکے گا۔

سورۃ المائدۃ میں فرمایا گیا:

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝٧٨ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ﴾ (آیات ۷۸'۷۹)

''بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی' کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔''

برائی اور بگاڑ کا آغاز پہلے تو چند افراد تک محدود ہوتا ہے۔ قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہو تو رائے عامہ کی بیداری کی بدولت فساد اور بگاڑ بڑھنے نہیں پاتا' اور اگر تساہل و تغافل کی بدولت اسے کم درجے کی برائی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے یا اس سے اغماض برتا جائے تو وہ پھیلتا چلا جاتا ہے اور پھر پوری سوسائٹی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ بنی اسرائیل کے بگاڑ کا موجب بھی یہی بات تھی جس کی وجہ سے حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ؑ کی زبان سے ان پر لعنت کی گئی۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝١٠٤﴾

''تم میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہی رہنا چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں' بھلائی کا حکم دیں اور برائی سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔''

اور اسی سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ

الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۱۰)

’’اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے‘ تم نیکی کا حکم دیتے ہو‘ بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔‘‘

دنیا کی امامت و رہنمائی کے منصب سے بنی اسرائیل کو اس لیے معزول کر دیا گیا کہ وہ فساد و بگاڑ میں اور بدیوں کے ارتکاب میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے معروف کی تلقین اور برائی سے روکنے کے عمل کو ترک کر دیا تھا‘ چنانچہ امامت عادلہ کا منصب عظیم امّت مسلمہ کے سپرد کر دیا گیا۔ بنی اسرائیل کی یہ محرومی اس فتنہ کی بدولت ان پر مسلّط ہوئی جس پر انہوں نے قناعت کر لی تھی۔

سورۃ الانفال میں اللہ تعالیٰ نے اس وبا کی ہلاکت خیزی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾﴾

’’اور بچو اس فتنہ سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو‘ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔‘‘

گویا جب گندگیوں کا فتنہ حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو وہ لوگ بھی تباہ ہو جاتے ہیں جو گناہگار سوسائٹی میں برائی کو گوارا کرتے رہے اور اس کے استیصال کی طرف انہوں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ غلاظت و نجاست جب پھیل جائے تو صفائی و ستھرائی کا تصور معدوم ہو کے رہ جاتا ہے اور عفیف دامن لوگ بھی اس فتنہ عام سے بچ نہیں پاتے‘ اس کی لپیٹ میں آ کر اپنا حلیہ مسخ کر لیتے ہیں۔

اصحابِ سبت میں بھی تین قسم کے لوگ موجود تھے۔ ایک تو وہ تھے جو بڑی بے باکی اور دھڑلے سے اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی کر رہے تھے اور دوسرے وہ تھے جو برائیوں میں براہِ راست ملوث تو نہ تھے مگر خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔ ان کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ ان کم بختوں کو نصیحت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں‘ اللہ تعالیٰ ان سے خود نمٹ لے گا۔ تیسرا گروہ وہ تھا جو نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھا‘ یہ گروہ سمجھتا تھا کہ اتمام حجت ضروری ہے‘ صراطِ مستقیم کی طرف بلایا جائے؟ اس کے باوجود اگر وہ باز نہیں آتے تو اللہ کی گرفت سے نہ بچ سکیں گے۔ وہ تو البتہ فرض کی ادائیگی کر کے اللہ کے ہاں ضرور سرخرو ہوں گے۔ اس آیۂ کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ لَا يُعَذِّبُ الْعَامَّةَ بِعَمَلِ الْخَاصَّةِ حَتّٰى يَرَوُا الْمُنْكَرَ بَيْنَ ظَهْرَانِيْهِمْ وَهُمْ قَادِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يُنْكِرُوْهُ فَلَا يُنْكِرُوْهُ ، فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَذَّبَ اللّٰهُ الْخَاصَّةَ وَالْعَامَّةَ)) (مجمع الزوائد للهيثمی ۷/۲۷۰)

’’یعنی اللہ عزوجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا جب تک عامۃ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے برے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہار ناراضی پر قادر ہوں اور وہ پھر اظہار ناراضی نہ کریں۔ پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔‘‘

’حق‘ کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ ویسے یہ متعدد مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً وہ ذات جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے۔ اسی معنی میں باری تعالیٰ پر حق کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ﴿فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾﴾ (یونس) ’’پس یہی اللہ تمہارا پروردگار برحق ہے‘ اور حق بات کے ظاہر ہونے کے بعد گمراہی کے سوا ہے ہی کیا؟ پھر تم کہاں پھرے جاتے ہو؟‘‘ اسی طرح ہر وہ چیز جو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کی گئی ہو۔ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ ...... مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ﴾ (یونس:۵) ’’وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں ...... یہ (سب کچھ) اللہ نے تدبیر سے پیدا کیا ہے‘‘۔ کسی چیز کے بارے میں اسی طرح کا اعتقاد رکھنا جیسا کہ وہ نفس واقع میں ہے۔ چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ بعث بعد الموت‘ ثواب و عقاب اور جنت و دوزخ کے متعلق فلاں کا اعتقاد حق ہے۔ وہ قول یا عمل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح پر کہ اس کا ہونا ضروری ہے اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو جس مقدار میں اور جس وقت اس کا ہونا واجب ہے۔ چنانچہ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ تمہاری بات یا تمہارا فعل حق ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے: ﴿كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ﴾ (یونس:۳۳) ’’اسی طرح تمہارے رب کا ارشاد ثابت ہو کر رہا۔‘‘ ﴿حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ﴾ (السجدة:۱۳) ’’میری طرف سے یہ بات قرار پا چکی ہے کہ میں دوزخ کو بھر دوں گا۔‘‘ فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾﴾

(الصفّ) ''اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا خواہ کافر ناخوش ہی ہوں''۔ ﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ﴾ (الصفّ:۹) ''وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے''۔ ﴿اَلۡحَآقَّةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الۡحَآقَّةُ ۚ﴿۲﴾﴾ (الحاقّۃ:۲۷) ''سچ مچ ہونے والی۔ وہ سچ مچ ہونے والی کیا ہے۔'' میں قیامت کی طرف اشارہ ہے' جیسا کہ یوم یقوم الناس سے اس کی تفسیر کی گئی ہے اور قیامت کو حاقۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں جزائے اعمال واقع ہوگی۔

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں حق کی لغوی اور معنوی تعبیر پیش کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ ایمان اور عمل صالح کے بعد حق کی وصیت اپنے اندر جامعیت کے متعدد پہلو سمیٹے ہوئے ہے' دنیا اور آخرت کی تمام تر بھلائیاں اس میں پنہاں ہیں۔ یہ اُمت مسلمہ کے فضل و شرف کی انتہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری جو انبیاء سے منسلک رہی اس کا تاج خیر امت سے ملقب کر کے اسے پہنایا۔ حق حکمت و عدل سے عبارت ہے۔ اللہ نے آسمان و زمین کو حق ہی کے ساتھ پیدا کیا ہے' اس کا قاعدہ ہے کہ وہ زمین کی خلافت اور نبوت و شریعت کی نعمت اسی قوم کو بخشتا ہے جو حق و راستی کی اطاعت میں سب سے آگے ہوتی ہے اور قسط کو قائم کرتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِكُمۡ﴾ (النساء:۱۳۵) ''اے ایمان والو! عدل کے قائم کرنے والے بنو اللہ کے لیے گواہی دیتے ہوئے (یعنی قسط کی گواہی) اگرچہ یہ گواہی تمہارے اپنے خلاف پڑے۔'' اہل ایمان کا خاصہ ہے: ﴿یَّهۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَبِهٖ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾﴾ (الاعراف) ''حق کے ساتھ رہنمائی کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں''۔ اسی طرح ﴿وَقٰلَ رَبِّ احۡكُمۡ بِالۡحَقِّ ؕ﴾ (الانبیاء:۱۱۲) ''اور کہا اے میرے ربّ حق کے ساتھ فیصلہ کر''۔ معلوم ہوا کہ حق کا قیام اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ضروری قرار دیا ہے' کیونکہ آسمانی بادشاہت کی بنیادیں اسی حق کی بنیاد پر قائم ہیں۔ فرمایا:

﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنٰكَ خَلِیۡفَةً فِی الۡاَرۡضِ فَاحۡكُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ بِالۡحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الۡهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَضِلُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌۢ بِمَا نَسُوۡا یَوۡمَ الۡحِسَابِ ﴿۲۶﴾﴾ (صٓ)

''اے داوٗد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے' پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ

فیصلہ کرو اور خواہش کے پیچھے نہ چلو (کیونکہ یہ حق کے راستے سے انحراف ہے) کہ تمہیں اللہ کے راستے سے ہٹا دے (اس آسمانی بادشاہت کے راستے سے جس کے تم اللہ کی طرف سے خلیفہ مقرر کیے گئے ہو) بے شک جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک جائیں گے ان کے لیے سخت عذاب ہے' اس وجہ سے کہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا''

اللہ تعالیٰ نے اُمت مسلمہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری سونپ کر اُمت کی شیرازہ بندی فرما دی ہے اور بتا دیا ہے کہ یہی وہ نظام ہے جو اُمت کی ترقی کا ضامن ہے۔ ﴿وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ﴾ کے الفاظ اس کی سرخ روئی اور عظمت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی اصل ذمہ داری ہی یہ ہے کہ وہ عمل صالح کریں اور ادائے حقوق میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ حقوق کی ادائیگی اور فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے خلافت کا قیام ناگزیر ہے' اس لیے کہ قوت و طاقت کے حصول کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں کہ عوام الناس کو منکرات سے روکا جائے اور ان کی ذمہ داریوں کو ان پر حقیقی معنوں میں لاگو کیا جائے۔ انہیں ان کے حقوق سے نوازنے میں خلافت کا قیام ضروری ہے۔ حق کے ایک خاص معنی مواسات اور ہمدردی کے بھی ہیں اور یہ صرف اخلاقی فضیلت ہی کے مماثل نہیں بلکہ وجوب کا درجہ رکھتی ہے۔

مفسّرِ قرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ نے لفظ حق کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لفظ کم از کم تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اولاً وہ بات جس کا واقع ہونا قطعی ہو' ثانیاً جو عقل کے نزدیک مسلّم ہو اور ثالثاً جو اخلاقاً فرض ہو۔ قرآن حکیم نے اس لفظ کو ان تمام معانی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً: ﴿اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهۡلِ النَّارِ ﴿۶۴﴾﴾ (صٓ) ''بے شک اہلِ دوزخ کا یہ جھگڑا ضرور واقع ہوگا''۔ ﴿ثُمَّ رُدُّوۡۤا اِلَی اللّٰهِ مَوۡلٰىهُمُ الۡحَقِّ ؕ﴾ (الانعام:۶۲) ''پھر وہ لوٹا دیے جاتے ہیں اللہ کی طرف جو ان کا مولیٰ ہے برحق''۔ ﴿وَفِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۱۹﴾﴾ (الذّٰریٰت) ''اور ان کے مالوں میں سائل و محروم کا حق ہے''۔ یعنی ایک واجب الادا قرض کی حیثیت سے...... گویا حق اپنے وسیع معنی میں اس چیز کو کہیں گے جو عقل و دل دونوں کو ایک ساتھ محبوب ہو اور جو علم و عمل دونوں پر یکساں طور پر حاوی ہو جائے اور نیز ظلم و فساد کی ضد ہو''۔ (مجموعہ تفاسیر فراہی' ص ۳۵۴)

اگر کسی کے نہاں خانہ دل میں ایمان کی چنگاری سلگ رہی ہو تو یہ ممکن نہیں کہ وہ فرد بن کر رہے اور برائی کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز نہ ہو اور وہ ایک اجتماع میں ڈھل کر ایک صالح معاشرہ وجود میں لانے کے لیے سرگرم عمل نہ ہو۔ ایمان سے ضوفشاں سینہ میں قلب مضطر

موجود ہوتا ہے اور وہ بھلائی کی آب و تاب کے لیے تڑپتا بھی ہے اور پھڑکتا بھی ہے۔ روشن سینہ سوز و درد سے سرشار رہتا ہے۔ اسی تناظر میں اقبالؒ نے کہا تھا:

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی!

''بازمانہ بساز'' حدیث بے خبراں ہے'' بازمانہ ستیز'' ہی اہل ایمان کا شیوہ ہے ۔

حدیث بے خبراں ہے تو بازمانہ بساز!
زمانہ با تو نہ سازد' تو بازمانہ ستیز!

بندۂ حق بین وحق اندیش اور حق شناس آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش رہتا ہے' وہ دانۂ اسپند کی طرح تڑختا نہیں' تو صیتِ حق کو وہ اپنی حقیقی ذمہ داری گردانتا ہے تا کہ معاشرے کا بگاڑ فزوں نہ ہونے پائے۔ وہ شرک' کفر' بدعت اور رسومِ سیّئہ سے خود ہی کنارہ کش نہیں ہوتا اور نہ صنم آشناؤں سے یارانہ گانٹھتا ہے بلکہ بہانگِ دہل وہ بات کہتا ہے جسے حق سمجھتا ہے' مداہنت اس کے مزاج سے لگا نہیں کھاتی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَمَّا وَقَعَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ فِي الْمَعَاصِيْ نَهَتْهُمْ عُلَمَاؤُهُمْ فَلَمْ يَنْتَهُوْا فَجَالَسُوْهُمْ فِيْ مَجَالِسِهِمْ وَوَاكَلُوْهُمْ وَشَارَبُوْهُمْ فَضَرَبَ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ وَلَعَنَهُمْ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ' ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ' قَالَ فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَكَانَ مُتَّكِئًا فَقَالَ: لَا' وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ' لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَاْخُذُنَّ عَلٰى يَدِ الظَّالِمِ وَلَتَاْطِرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ اَطْرًا اَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ)) (رواہ ابو داؤد والترمذی)

''جب بنی اسرائیل اللہ کی نافرمانیوں کے کام کرنے لگے تو ان کے علماء نے انہیں روکا لیکن وہ نہیں رکے (تو ان کے عالم ان کا بائیکاٹ کرنے کے بجائے) ان کی مجلسوں میں بیٹھنے لگے اور ان کے ساتھ کھانے پینے لگے۔ جب ایسا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کے دل ایک جیسے کر دیے اور پھر حضرت داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے اللہ نے ان پر لعنت کی۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی راہ اختیار کی اور اسی میں بڑھتے چلے

گئے۔ عبداللہ بن مسعودؓ (جو اس حدیث کے راوی ہیں) فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے بیٹھے تھے' پھر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا: ''نہیں' اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے' تم ضرور لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے رہو گے اور برائیوں سے روکتے رہو گے اور ظالم کا ہاتھ پکڑ لو گے اور ظالم کو حق پر جھکاؤ گے۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو تم سب کے دل بھی ایک ہی طرح کے ہو جائیں گے اور پھر اللہ تم کو اپنی رحمت اور ہدایت سے دور پھینک دے گا جس طرح بنی اسرائیل کے ساتھ اس نے معاملہ کیا۔''

ایمان اور عمل صالح کے ساتھ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے اجزاء خاصے معنی خیز ہیں۔ تواصی وصیت سے مشتق ہے۔ کسی شخص کو جب پوری تاکید کے ساتھ نہایت اثر انگیز انداز میں بات سمجھائی جائے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کی جائے تو اس کا نام وصیت ہے۔ دراصل کسی کو پند و موعظت سے کسی کام کے کرنے پر ابھارنا اور برانگیختہ کرنا وصیت ہے۔ مرنے والا بھی اپنے ورثاء کو کچھ ہدایات دیتا ہے تو وہ وصیت کہلاتی ہیں۔ اس میں تسلسل کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ وہ زمین جس میں مسلسل کاشت ہوتی ہے اور فصلیں اگتی ہیں اس زمین کو بھی ارض واصیہ کہا جاتا ہے۔ گویا وصیت یعنی تواصی میں محبت' شفقت اور دل سوزی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ معروف کا حکم کرنے اور منکر سے روکنے میں یہ پہلو ہر لحظہ پیش نظر رہنا چاہیے تا کہ اس طرزِ تبلیغ و تلقین اور تنذیر و تبشیر سے خوشگوار نتائج مرتب ہوں۔ المختصر قرآن و حدیث میں ہر مسلمان پر یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی مقدرت کے مطابق امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ادا کرے اور اس سلسلے میں کسی غفلت اور تساہل میں مبتلا نہ ہو اور اس راہ کی مشکلات کو صبر و عزیمت سے برداشت کرتا رہے۔ اس کی نجات کا راز اسی امر میں مضمر ہے۔

اخذ و استفادہ

☆ تفہیم القرآن' جلد اول' دوم' پنجم' ہشتم۔
☆ معارف القرآن' جلد ہشتم
☆ مجموعہ تفاسیر فراہی۔
☆ ضیاء القرآن۔
☆ مفردات القرآن
☆ المعجم المفہرس۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

حیاتِ مستعار کی قدر و قیمت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یہ دنیا فانی ہے۔ یہاں ہر شے کی ایک عمر ہے جب اس کی عمر پوری ہو جاتی ہے تو وہ فنا اور معدوم ہو جاتی ہے۔ ایک دن آئے گا جب تمام کائنات کی عمر اختتام کو پہنچ جائے گی‘ اسی دن کا نام قیامت ہے۔ قرآن مجید میں اس دن کو ’’السَّاعَة‘‘ بھی کہا گیا ہے۔ جس طرح کائنات میں موجود ہر شے کی ایک عمر ہے اسی طرح ہر انسان کی بھی عمر مقرر ہے جس کا اسے پتا نہیں۔ کسی آدمی کو لمبی عمر ملتی ہے اور کسی کو تھوڑی۔ لیکن جب اس کی یہ مہلت عمر ختم ہو جاتی ہے تو پھر اس میں ایک لمحے کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

نباتات‘ جمادات اور حیوانات کو تو فنا ہوتے ہم دیکھتے ہیں‘ لیکن انسان کا معاملہ جدا ہے۔ یہ اپنی عمر پوری کر کے فنا نہیں ہوتا‘ بلکہ موت کے ساتھ ہی اس کی اگلی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے اور یہ وہ زندگی ہے جس کا کوئی اخیر (end) نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اس لیے نہیں پیدا کیا گیا کہ وہ مر کے مٹی ہو جائے بلکہ وہ یہاں امتحان کے وقفے میں ہے‘ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک:۲) ’’جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تم کو جانچے کون تم میں اچھا عمل کرتا ہے‘‘۔ گویا انسان ہر لحہ امتحان میں ہے‘ جو عمل وہ اپنی مہلت عمر میں کرتا ہے اس کا نتیجہ جزا اور سزا کی صورت میں نکلے گا۔ جس شخص نے اپنی عمر مقصد تخلیق کے مطابق بسر کی وہ کامیاب رہے گا اور اگلی اور حقیقی زندگی میں خوش وخرم رہے گا‘ جبکہ جس نے مقصد تخلیق سے بے خبر حیوانوں کی سطح پر زندگی گزاری وہ اگلی زندگی میں کرب واذیت اور عذاب میں مبتلا رہے گا‘ کیونکہ اس نے عمر کے وقفے کی قدر نہ پہچانی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انمول تحفہ تھا۔

انسان کی زندگی کا مقصد عبادتِ رب ہے‘ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ (الذّٰریٰت) ’’اور میں نے انسانوں اور جنوں کو

محض اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں‘‘۔ عبادت کا معنی ہے بندگی‘ یعنی انسان اپنے آپ کو اللہ کا بندہ سمجھتے ہوئے زندگی گزارے۔ جس طرح غلام اپنے آقا کے کسی حکم کو نہیں ٹال سکتا اس طرح انسان کو بھی اپنے مالک و خالق کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ سراسر خسارے میں ہے۔ دراصل وہ ایسا انسان ہے جو شکل و صورت میں تو آدمی ہے مگر موت کے بعد اس کا انجام جانوروں سے بھی بدتر ہوگا‘ کیونکہ جانور تو مر کر مٹی ہو جاتے ہیں‘ ان کا کوئی حساب کتاب نہیں‘ جبکہ انسان کو اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہوگی‘ جس کے نتیجے میں اس کی آئندہ آنے والی حقیقی اور لامتناہی زندگی خوشی اور مسرت میں گزرے گی یا پھر وہ عذاب میں ڈالا جائے گا اور جہنم کی آگ میں جلتا رہے گا۔

معلوم ہوا کہ یہ دُنیوی زندگی انتہائی محتاط رہ کر گزارنی چاہیے اور ہر وقت عاقبت کی مسئولیت ذہن میں تازہ رہنا چاہیے۔ جو شخص اس انداز میں زندگی گزارے گا اس کا سونا (جبکہ وہ عبادت نہیں کر رہا) بھی عبادت شمار ہوگا۔ آخرت کی مسئولیت کا یہ انداز انسان کو غلط‘ ناجائز اور نافرمانی کے کاموں سے بچا سکتا ہے ورنہ نفس تو برائیوں کی طرف ہی آمادہ کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ﴾ (یوسف:۵۳) ’’بے شک نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے سوائے اس کے کہ میرا رب رحم کر دے‘‘۔

مہلت عمر وقت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے‘ لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ وقت کا ضائع کرنا موت سے زیادہ خطرناک ہے‘ کیونکہ وقت کا ضائع کرنا اللہ اور آخرت کے گھر سے جدا کرتا ہے اور موت تو صرف اہل دنیا اور اپنے عزیز و اقارب سے جدا کرتی ہے۔ وقت وہ نعمت ہے جس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ وقت کا وہ ٹکڑا جو ہر انسان کو دنیوی زندگی کی صورت میں عطا کیا گیا ہے اس میں کسی خاص گروپ‘ خاندان‘ طبقہ‘ رنگ ونسل‘ ملک و شہر‘ تونگری اور مفلسی کا کوئی لحاظ نہیں‘ بلکہ یہ ہر ایک کے لیے برابر ہے۔ یہ انسان کا شعور اور فکر ہی ہے جو وقت کی قدر و قیمت کا احساس دلاتا ہے۔ وقت کی نعمت سے صحیح استفادہ کرنے والا ہی انسان کہلانے کا مستحق ہے اور وہی فلاح پائے گا اور اس دن میدان مار لے گا جس دن کوئی کسی کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔ ہر انسان کو اُس کا نامۂ اعمال پکڑا دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ تمہارے اعمال کا ریکارڈ ہے‘ دیکھو اس میں کوئی کمی بیشی تو نہیں کی گئی؟ اس وقت انسان کہے گا: ﴿یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا كَبِیْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ (الکہف:۴۹)

’’ہائے ہماری خرابی‘ یہ کیسا نوشتہ ہے کہ اس نے نہ تو کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ بڑی چیز کو‘ مگر اس کو محفوظ کر رکھا ہے‘‘۔ چونکہ اس وقت انسان دار العمل سے نکل کر دار الجزا میں داخل ہو چکا ہو گا اس لیے حسرت و یاس کے سوا اس کے پاس کچھ نہ ہو گا۔ وہ کوئی عذر نہ پیش کر سکے گا اور اگر کرے گا تو سنا نہ جائے گا‘ کیونکہ اسے دنیا میں بتا دیا گیا تھا کہ مہلت ختم ہونے پر حساب کا دن آئے گا جس میں ذرّہ برابر کیا ہوا عمل بھی سامنے آ جائے گا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ (الزلزال) ’’اور جس نے ذرّہ برابر بھلائی کی ہو گی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرّہ برابر برائی کی ہو گی وہ بھی اس کو دیکھ لے گا‘‘۔ آج جو ظالم ہے وہ اس بات سے بے خبر کمزوروں‘ بے بسوں اور ناتوانوں پر ظلم و زیادتی کر رہا ہے‘ اپنی طاقت‘ دولت اور پوزیشن پر خوش ہو رہا ہے اور ’’ہمچو ما دیگرے نیست‘‘ کے زعم میں مبتلا ہے‘ لیکن یہی ظالم جب اپنے ظلم اور زیادتیوں کو دیکھے گا تو اس کی بے بسی اور یاس دیدنی ہو گی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۝﴾ (الفرقان) ’’اُس دن ظالم اپنے ہاتھ کاٹ کھائے گا اور کہے گا اے کاش میں نے رسول کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا‘‘۔ جب بدکردار‘ ظالم اور نافرمان یہ حال دیکھے گا تو اوّل واپس دنیا میں جانے کی تمنا کرے گا جس کا کوئی امکان نہ ہو گا۔ پھر حسرت کے ساتھ کہے گا کاش میں مٹی ہوتا اور اس احتساب سے بچ جاتا‘ مگر وہ دن ایسا ہو گا کہ کسی طرح کا عذر پیش کرنے کا کوئی موقعہ نہ ہو گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝﴾ (النبا) ’’اُس دن آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا (از قسم ظلم و زیادتی) اور کہے گا اے کاش میں مٹی ہو جاتا!‘‘

جس طرح ایک طالب علم اپنے شب و روز لہو و لعب میں گزار کر ناکامی کا منہ دیکھتا ہے اسی طرح گزرتے ہوئے وقت کی اہمیت کا اندازہ نہ کرنے والا ناکام و نامراد ہو گا۔ طالب علم تو ناکام ہو جائے تو وہ اس صدمے کے بعد وقت سے فائدہ اٹھانے کا عزم کر کے اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدل سکتا ہے‘ لیکن جس شخص نے زندگی آزادانہ گزاری‘ نیکی اور بدی میں فرق نہ کیا‘ دولت اور عزت حاصل کرنے کے لیے جائز اور ناجائز کا فرق نہ جانا اور اسی حال میں مر گیا تو اب اس کے پاس دنیا میں واپس جانے کا کوئی موقعہ قطعاً نہ ہو گا خواہ وہ کتنا ہی چیخے چلائے۔

وقت ایک ایسی تیز رفتار گاڑی ہے کہ کوئی بھی شخص اس کے پیچھے بھاگ کر اس کو نہ پکڑ سکتا ہے اور نہ واپس لا سکتا ہے۔ اسی حقیقت کو کسی شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں!

’’آج کا کام کل پر مت چھوڑو‘‘ کا بھی یہی مطلب ہے کہ آج کے اوقات کا بھرپور استعمال کر لو۔ جو دن کل طلوع ہو گا اس کے گھنٹے اور منٹ کل کے لیے ہوں گے‘ ان سے آج کے ضائع کردہ وقت کی تلافی ناممکن ہے۔ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر دوبارہ جوانی کے دن لوٹ آنے کی تمنا کبھی پوری نہیں ہوتی۔ آج کا دن ہی فائدہ اٹھانے کا دن ہے جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ آج کا دن بھی لمحہ بہ لمحہ گزر رہا ہے۔ سورج غروب ہو جائے گا تو یہ دن بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ماضی کے واقعات کو یاد کر کے ان پر آنسو بہانا حماقت اور جنون کی علامت ہے اور موجودہ زندگی کے لمحات کو تلخ بنانا ہے ؏

یادِ ماضی عذاب ہے یارب! چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

گزرا ہوا وقت قبر میں پڑے ہوئے مردے کی مانند ہے جسے رونے دھونے سے کبھی بھی زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کی قدر و قیمت جاننے والے ایک عارف نے کیا خوب کہا ہے ؏ ’’جو دم غافل سو دم کافر‘‘ یعنی جو سانس غفلت میں بسر ہوئے وہ کفر میں گزرے۔ جس طرح کافر اپنے خالق اور مالک کا نافرمان ہوتا ہے غفلت میں زندگی گزارنے والے کا رویہ بھی کافرانہ ہے۔

شعور انسان کو دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس امتیازی اور خصوصی عطیے پر انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کا شکر ادا کرے‘ جس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی عطا کردہ نعمتوں کا اس کی رضا کے مطابق استعمال کرے۔ انسان کے اندر شعور کا سرچشمہ ضمیر ہے جو حق و باطل میں تمیز کرتا ہے‘ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ (الشمس) ’’پھر اس کو گناہ اور نیکی سجھا دی‘‘۔ اگر انسان باطل پرست ہو جائے اور معصیت کی زندگی اختیار کر لے تو اس کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے‘ ایسے انسان کو صحیح اور غلط‘ جائز اور ناجائز میں تمیز نہیں رہتی۔ اگر کسی شخص نے اپنے اوقات بے دریغ نافرمانی اور من مانی میں گزارے تو اس جیسا بدنصیب کوئی نہ ہو گا۔ چنانچہ انسان کے شایانِ شان یہ ہے کہ وہ نہ تو ماضی پر آنسو بہائے اور نہ مستقبل کے سہانے سپنے دیکھنے شروع کر دے‘ کیونکہ خواب اس وقت تک

شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا جب تک اس کے لیے عملی جدّوجہد نہ کی جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی﴿۳۹﴾﴾ (النجم) ''اور یہ کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے اس نے جدّوجہد کی۔'' پس صحیح سمت میں سعی و جُہد کرنا ہی انسان کو زیب دیتا ہے۔

اس زندگی کو جتنی بھی اہمیت دی جائے کم ہے' کیونکہ جو ماہ و سال بلکہ منٹ اور سیکنڈ گزر گئے وہ واپس نہیں آ سکتے۔ دنیا کا قیمتی سے قیمتی مال چوری ہو جائے یا ضائع ہو جائے تو اس کو جدوجہد کر کے دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے' مگر زندگی کے گزرے ہوئے یا ضائع شدہ لمحات کسی صورت واپس نہیں ہو سکتے۔ اگر ضیاعِ وقت کو ایک خاموش قاتل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وقت کے ضیاع کا حاصل افسوس اور ندامت کے سوا کچھ نہیں۔ ایسا طرزِ عمل انسان کو زیب نہیں دیتا جس پر افسوس کرنا پڑے' ندامت اٹھانی پڑے اور ہاتھ پھر بھی کچھ نہ آئے۔ ایک دانا نے کہا ہے: ''چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی!'' یعنی عقلمند شخص ایسا کام کیوں کرے گا جس پر اسے شرمندگی اٹھانی پڑے۔ یہ زندگی جو مل گئی ہے بس ایک ہی دفعہ ہے' اگر اسے فضول کاموں یا سستی' کاہلی اور غفلت میں گزارا گیا تو اس سے بڑا خسارہ کوئی نہیں کہ ایسی زندگی ابدی سزا اور دائمی عذاب کا باعث بن جائے گی۔ گناہ کی لذت میں گزری ہوئی زندگی انسان کو جہنم کی آگ میں لے جائے گی' چنانچہ وقت ضائع کرنے والے تمام کام گناہ کے ہیں جن سے بچ کر زندگی گزارنا ہی دانش مندی ہے۔

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 45 روپے   اشاعت عام: 25 روپے

مایوسی گمراہی ہے!

شمس الحق اعوان

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۝۵۶﴾ (الحجر)

’کہا اور کون ہے اپنے رب کی رحمت سے مایوس ماسوائے ان کے جو گمراہ ہیں۔‘‘

اس موضوع کے حوالے سے میرا قارئین سے ایک سوال ہے کہ اگر کوئی طالب علم کمرۂ امتحان میں پرچہ حل کرنے کے بجائے مایوس ہو کر بیٹھ جائے تو کیا مُمتحن پرچہ لینا بند کر دے گا؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ بعینہٖ اللہ ربّ العزت نے انسان کو دنیا میں ایک خاص مقصد اور مشن کے لیے بھیجا۔ اسے اشرف المخلوقات بنایا‘ خلافت ارضی کا منصب عطا کیا‘ اس کو جاننے‘ سمجھنے اور غور وفکر کرنے کی صلاحیتیں عطا کیں‘ عمل کرنے کے خاص اختیارات دیئے‘ دنیا میں رہنے کے لیے خاص ہدایات دیں‘ عملی نمونہ کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث کیے‘ انبیاء کرام کے ذریعے وقتاً فوقتاً کتب نازل کیں جن کے ذریعے واضح کر دیا کہ یہ دنیا دار العمل ہے‘ اور جنّت صرف متّقین کے لیے ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۳۲﴾ (الانعام)

’’یہ دنیا کی زندگی تو کچھ بھی نہیں سوائے کھیل اور تماشے کے۔ اور آخرت کا گھر بہتر ہے پرہیز گاروں کے لیے۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟‘‘

قرآن حکیم میں اتنا واضح نصب العین اور مقصدِ حیات بیان کر کے فرما دیا گیا ہے کہ ہم لازماً آزمائیں گے کہ کون ہے جو کمرۂ امتحان میں پرچہ صحیح حل کرتا ہے اور کون ہے جو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ بالخصوص جنت جیسا عظیم انعام‘ جس میں جو چاہو گے دستیاب ہوگا‘ اگر حاصل کرنا ہے تو سر دھڑ کی بازی لگانی پڑے گی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝۳۱ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝۳۲﴾ (حٰمٓ السجدة)

’’تمہارے لیے اس میں ہے جو تمہارا جی چاہے اور تمہارے لیے اس میں ہے جو تم مانگو۔ (یہ) بخشنے والے مہربان کی طرف سے مہمانی ہے۔‘‘

لیکن ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم ہر روز موت و حیات کا منظر دیکھنے کے باوجود زندگی کی اصل حقیقت تک پہنچنے سے محروم ہیں اور اسے وقت گزاری اور دنیا سازی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہ مثل زبان زدِ عام ہے: ’’ایہہ جگ مٹھا اگلا کس ڈِٹھا!‘‘ یعنی یہ دنیا تو میٹھی ہے اور اگلی دنیا کس نے دیکھی ہے؟ ع ’’بابر بعیش کوش کہ عالَم دوبارہ نیست‘‘ یعنی جتنا عیش کر سکتے ہو کر لو دنیا دوبارہ نہیں آئے گی۔ ان طور طریقوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صاحب اختیار اپنے اختیارات کا بھرپور استعمال کر کے عوام کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑنے میں مسرت محسوس کرتے ہیں اور غریب عوام دو وقت کی روٹی کے حصول کے لیے روز وشب ایک کر دیتے ہیں۔ انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام واقوال سننے‘ سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ رہے وہ لوگ جو دعوت وتبلیغ‘ جمعہ اور جماعت سے منسلک ہیں ان کی وعظ ونصیحت کا مرکز عملی دنیا سے ماورا ایسے معاملات سے ہے جن کا ایوانِ اقتدار میں انقلاب برپا کرنے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ گویا عوام الناس اجتماعی معاملات کی رہنمائی سے محروم ہیں‘ جس کا نتیجہ انتشار اور بدعملی کے علاوہ اور کیا نکل سکتا ہے۔

دریں حالات انسان جب کسی غلط کام کے لیے پہلا قدم اٹھاتا ہے تو وہ اٹھاتا ہی چلا جاتا ہے‘ کیونکہ معاشرے میں اس کی حوصلہ شکنی کرنے کے بجائے حوصلہ افزائی کرنے والے بکثرت مل جاتے ہیں اور وہ اس میں اس قدر مگن ہوتا ہے کہ پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا کہ میں دنیا میں کس مقصد کے لیے آیا تھا۔ تاہم زندگی ایک ایسی کتاب ہے جس کے اوراق وقتاً فوقتاً اس پر نورِ حقیقت کو واضح کرتے رہتے ہیں۔ کبھی خود بیمار ہو جاتا ہے یا کبھی کوئی عزیز اس کے ہاتھوں میں چل بستا ہے تو اسے اگلا جہان یاد آتا ہے‘ پھر اسے کف افسوس ملنا پڑتا ہے۔ لیکن اس وقت وہ اس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے جہاں سوائے ناامیدی اور مایوسی کے کچھ نظر نہیں آتا۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ اسے ظلمت کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیتا ہے اور وہ بے یار و مددگار بھٹکنے لگتا ہے۔ لیکن اسے مایوس نہیں ہونا چاہیے‘ کیونکہ اللہ ربّ العزت نے مایوسی سے نکالنے کے لیے دو اہتمام فرمائے ہیں:

(۱) پہلا یہ کہ دنیا میں بھیجتے وقت اسے بااختیار اور باشعور بنایا۔ احسن تقویم کا مطلب ہی یہ

ہے کہ اگر وہ کوئی گناہ کر لے تو اسے مایوس ہونے کی بجائے توبہ کا راستہ نظر آ جائے۔ یہ علم اسے عالمِ ارواح میں دیا گیا۔ دنیا میں آتے وقت اس کے تحت الشعور میں فہم اور تدبّر کی صلاحیتیں راسخ کیں۔ شعور اور لاشعور میں تخلیقی اور تدبیری تعلق استوار کیا تاکہ ماحول کی گم گشتگی میں سررشتہ ہدایت ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔

(۲) دوسرا انتظام یہ کیا کہ انبیاء کرام ﷺ بھیجے تاکہ نسیان اور جذبات کی شدت میں اگر انسان صراطِ مستقیم سے ہٹ جائے تو وہ اس کو اصل منزل یاد دلا دیں اور پھر اس منزل تک پہنچنے کے لیے صراطِ مستقیم پر چل کر بھی دکھا دیں۔ ہر قوم‘ ہر مسلک اور ہر دور میں پیغمبر آتے رہے جو بگڑی اور بھولی بسری اُمت کو ازسرِنو بھولا ہوا سبق یاد کراتے رہے۔ ہر پیغمبر کا ایک پیغام اور ایک ہی درس تھا کہ اس کائنات کا ایک ہی خالق اور مالک ہے اور وہ ربّ العالمین ہے۔ اس کا نام اللہ ہے اور وہ ’’ارحم الراحمین‘‘ ہے‘ لہٰذا زندگی کے کسی بھی موڑ پر اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا اعلانِ عام ہے:

﴿قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۳﴾﴾ (الزّمر)

’’کہہ دیجیے اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ بے شک اللہ سارے گناہ بخشنے والا ہے۔ بے شک وہ غفور اور رحیم ہے۔‘‘

اِنفرادی زندگی میں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی لاتعداد مثالیں مل جاتی ہیں‘ اجتماعی زندگی کے حوالے سے اہلِ عرب کی بدنظمی اور انتشار کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں ؎

کبھی پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
کبھی گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا

اس انتشار کی وجہ سے ان کی دنیا میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ جب انہوں نے پیغمبر اعظم ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا اور آپؐ کی قیادت میں بنیانِ مرصوص بن گئے تو پھر یہ عالم تھا کہ ؎

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی!

انسانی شعور جب بلوغت کے مقام پر پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کا سلسلہ بند کر دیا‘ البتہ ان کا پیغام‘ ان کی دعوت ’’قرآن حکیم‘‘ کی شکل میں محفوظ کر دی گئی جو ہماری مایوسیوں کا علاج اور ہماری رہنمائی کا سامان ہے۔ سورۃ الزمر کی مذکورہ بالا آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام گناہ بخشنے والا ہے‘ بشرطیکہ خطا کار گناہوں سے توبہ کرے اور اس کی طرف پلٹے۔

بنی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ احادیث میں بیان ہوا ہے کہ اس نے ننانوے (۹۹) قتل کیے تھے‘ جب احساس ہوا تو توبہ کے لیے ایک عیسائی راہب کے پاس گیا اور پوچھا کیا میری توبہ قبول ہو جائے گی؟ اُس نے کہا ’’نہیں‘‘۔ اس نے سوچا جہاں ننانوے قتل کیے ہیں وہاں سو (۱۰۰) ہو جائیں گے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ لہٰذا اس نے راہب کو بھی قتل کر دیا اور سو کی تعداد پوری کر لی۔ لیکن اس قاتل کو اطمینانِ قلبی نصیب نہ ہوا۔ تلاش کرتے کرتے بالآخر وہ ایک عالم کے پاس جا پہنچا۔ اس نے اس عالم کو بتایا کہ وہ سو انسانوں کو قتل کر چکا ہے‘ کیا اس کے لیے توبہ کا کوئی امکان ہے‘ اُس نے کہا کیوں نہیں! تمہارے اور تمہاری توبہ کے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے؟ تم فلاں جگہ چلے جاؤ‘ وہاں ایسے لوگ آباد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے ہیں‘ تم بھی ان کے ساتھ مل کر اللہ کی بندگی اور پرستش کرو‘ اور تم اپنے وطن کی طرف واپس مت جانا‘ کیونکہ وہ بری جگہ ہے۔ تو وہ شخص چل پڑا۔ یہاں تک کہ جب اس نے آدھا راستہ طے کر لیا تو اس کو موت آ گئی اور وہاں اس کی جان قبض کرنے کے لیے جنت اور دوزخ دونوں کے فرشتے آ گئے۔ چنانچہ اس کے بارے میں رحمت اور عذاب کے فرشتے جھگڑ پڑے۔ رحمت (جنت) کے فرشتوں نے کہا کہ یہ شخص خلوص سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کر رہا تھا۔ اور عذاب والے فرشتے کہنے لگے کہ اس نے کبھی کوئی نیک عمل تو کیا ہی نہیں! تو ان کے پاس اللہ تعالیٰ نے ایک اور فرشتے کو انسانی شکل میں بھیج دیا اور ان فرشتوں نے اس کو اپنے درمیان ثالث بنا لیا۔ اُس نے کہا کہ تم دونوں جگہوں کا فاصلہ ناپ لو‘ جس زمین کے یہ زیادہ قریب ہو وہی اس کا حکم ہے۔ جب فاصلہ ناپا گیا تو جس طرف وہ جا رہا تھا وہ جگہ زیادہ قریب نکلی۔ چنانچہ رحمت کے فرشتے اس بندے کو (جنت میں) لے گئے۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے۔ اس واقعہ سے بھی پتا چلتا ہے کہ انسان کبھی بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

قرآن حکیم مسلسل اعلان کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ توبہ کریں اور آگے بڑھیں:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٢٨﴾﴾ (الشوریٰ)

’’وہی ہے جو اُتارتا ہے مینہ بعد اس کے کہ آس توڑ چکے اور پھیلاتا ہے اپنی رحمت۔ اور وہی ہے کام بنانے والا۔‘‘

انسانی مزاج یہ ہے کہ اگر اسے بھلائی اور خیر مل رہی ہو تو وہ مسلسل مانگتا جاتا ہے اور مانگنے سے نہیں تھکتا‘ لیکن اگر نہ ملے اور آزمائش کی وجہ سے رک جائے تو مایوس ہو جاتا ہے۔ اس انسانی نفسیات کی ترجمانی حسب ذیل آیات سے ہو جائے گی:

﴿لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَاۗءِ الْخَيْرِ ۡ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـــُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ﴿٤٩﴾﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

’’نہیں تھکتا آدمی مانگنے سے بھلائی‘ اور اگر لگ جائے اسے برائی تو آس توڑ بیٹھتا ہے ناامید ہو کر۔‘‘

﴿قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ ﴿٥٦﴾﴾ (الحجر)

’’بولا اور کون آس توڑے اپنے رب کی رحمت سے مگر جو گمراہ ہیں۔‘‘

اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر گمراہوں کی صف میں شامل ہونا بہت بڑا جرم ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں گمراہی سے بچنے کے لیے دعا مانگی جاتی ہے۔ شاید ہمارے ذہن میں کبھی اس بات کا احساس تک نہ ہوا ہو کہ صرف مایوس ہونے کے سبب ہمارا شمار ’’الضَّآلِّيْنَ‘‘ میں ہو جائے گا۔ لہٰذا غور کرنا چاہیے کہ لاشعوری طور پر ہم ایک ایسے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں جسے جرم سمجھا ہی نہیں جاتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے‘ آمین ثم آمین!

مایوسی سے بچنے کے دو طریقے اور مدارج ہیں: (i) رجوع الی اللہ یعنی توبہ اور (۲) اعمال صالحہ کی پابندی۔

توبہ کی عظمت

توبہ وہ عمل ہے جو نہ صرف گزشتہ تمام گناہوں کو دھو ڈالتا ہے بلکہ گزشتہ گناہوں کو نیکیوں میں بھی تبدیل کر دیتا ہے۔ سورۃ الفرقان میں فرمایا:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰۗىِٕكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَـيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٧٠﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ

يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿٧١﴾﴾

’’مگر جس نے توبہ کی اور ایمان و یقین لایا اور نیک کام کیے سو اللہ ان کی برائیوں کو اچھائیوں میں بدل دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور جو کوئی توبہ کرے اور عمل صالح کرے تو وہ پھر آتا ہے اللہ کی طرف پھر آنے کی جگہ۔‘‘

سورۂ مریم میں فرمایا:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَـيْــــًٔا ﴿٦٠﴾﴾

’’مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیکی کی‘ سو یہی لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔‘‘

ان آیات میں کتنی بڑی خوشخبری ہے۔ وہ لوگ جن کی زندگی مختلف جرائم میں ملوث رہی ہو اور انہیں معافی کی امید بھی نہ ہو تو وہ معاشرے میں فساد پھیلانے کے علاوہ اور کیا کردار انجام دیں گے۔ ان کو ان آیات اور توبہ کے بارے میں بتانا ضروری ہے تاکہ وہ مایوسی چھوڑ کر بارگاہِ الٰہی میں معافی کے طلب گار ہوں اور پھر ایک اچھے انسان کی طرح عزت دار بن کر معاشرے میں زندگی گزاریں۔

توبہ وہ نعمت عظمیٰ ہے جس نے عرب کے معاشرے کو ’’اسفل سافلین‘‘ سے ’’احسن تقویم‘‘ کے مقام پر پہنچا دیا۔ دورِ نبوی کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔ حضرت ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت میرے حجرے کے باہر کھڑی تھی‘ میں نے سلام کیا اور مزید توجہ دیے بغیر حجرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور استفسار کیا کہ مجھ سے زنا کا جرم سرزد ہوا اور ایک بچہ بھی پیدا ہوا جسے میں نے مار ڈالا‘ کیا اسلام میں میرے لیے کوئی گنجائش ہے؟ میں نے کہا ’’نہیں‘‘۔ اس پر وہ روتی ہوئی چلی گئی۔ اگلے دن میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ واقعہ سنایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تو نے سورۃ الفرقان کی آیات نہیں پڑھیں:

﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿٧١﴾﴾

’’جو کوئی توبہ کرے اور نیک کام کرے تو وہ پھر آتا ہے اللہ کی طرف پھر آنے کی جگہ۔‘‘

یہ سن کر میں نے عورت کو تلاش کیا اور نبی اکرم ﷺ کا فرمان سنایا۔ وہ یہ سنتے ہی سجدے میں گر گئی اور اپنی لونڈی کو آزاد کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ؎

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ!

’’یہ درگاہ میری درگاہ ہے جہاں نا امیدی نہیں‘ اگر سو بار بھی توبہ ٹوٹ جائے تو بھی مایوس نہ ہو‘ واپس آ جا!‘‘

توبہ کن کی قبول نہیں ہوتی

توبہ کا معنی ہے پلٹنا‘ رجوع کرنا۔ اگر غلطی اور نادانی سے توبہ ٹوٹ جائے یا انسان توبہ نہ کر سکے تو موت سے پہلے تک توبہ کر لینے سے اللہ کے ہاں توبہ قبول ہو جائے گی۔ لیکن اگر حالت نزع ہو جائے تو اُس وقت توبہ قبول نہیں ہو گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِـيْمًا ﴿١٨﴾﴾ (النساء)

’’اور ایسوں کی توبہ قبول نہیں ہے جو گناہ کیے جاتے ہیں‘ یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت آ جائے تو کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ہی ایسوں کی توبہ جو حالت کفر میں مرتے ہیں۔ ان کے لیے تو ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔‘‘

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ یَقْبَلُ تَوْبَۃَ الْعَبْدِ مَا لَمْ یُغَرْغِرْ)) (رواہ الترمذی)

’’بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک حالتِ نزع میں نہ پہنچے۔‘‘

حاصل کلام یہ ہے کہ توبہ کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا۔ قوم اور اُمت کے لیے اب بھی موقع ہے کہ اجتماعی توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرے اور جس مقصد کے لیے یہ خطہ زمین حاصل کیا تھا اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یکسو ہو جائے۔ تنظیم اسلامی نے قوم کی توجہ کئی بار اس امر کی طرف دلائی ہے اور اجتماعی توبہ کی منادی دی ہے تاکہ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے مشترکہ جدوجہد کریں جس کے لیے یہ ملک حاصل کیا تھا۔ ہم آج بھی اسی پکار کو سربلند کیے ہوئے ہیں اور پر امید ہیں کہ ایک نہ ایک دن قوم اس پر لبیک کہے گی اور سمجھ لے گی کہ ’’اسلام بذریعہ انقلاب ہی ممکن ہے‘‘ ع

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ!

میّت کے حقوق

اور اُن کی ادائیگی کا مسنون طریقہ

حافظ محمد زاہد☆

روزِ اوّل سے یہ قدرت کا قانون ہے کہ جو اِس دنیا میں آیا ہے اُس نے ایک دن یہاں سے چلے جانا ہے۔ قرآن حکیم میں اس قانون کو جابجا مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ العنکبوت میں فرمایا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ قف ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿٥٧﴾﴾

''ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ پھر تم سب نے ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔''

اسی طرح سورۃ الزمر میں اس قانونِ قدرت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿٣٠﴾﴾

''(اے نبی ﷺ!) بے شک آپ بھی فوت ہوں گے اور وہ بھی وفات پائیں گے۔''

اس حوالے سے اسلام کی حقانیت ملاحظہ ہو کہ اسلام میں اس دنیا میں آنے والوں یعنی زندہ لوگوں کے حقوق کے ساتھ ساتھ اس دنیا سے جانے والوں یعنی مُردوں کے حقوق بھی متعین کیے گئے ہیں جن کو ادا کرنا زندہ لوگوں کے ذمے ہے۔ ذیل میں ان حقوق اور ان کی ادائیگی کا طریقہ بیان کیا جا رہا ہے۔

① قریب الموت شخص کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرنا

جس شخص پر موت کے آثار واضح ہونے شروع ہو جائیں اس کے پاس موجود ورثاء کو چاہیے کہ وہ اس کے سامنے لا الٰہ الا اللہ کا ورد شروع کر دیں تاکہ ان کو دیکھ کر قریب الموت شخص بھی لا الٰہ الا اللہ پڑھنا شروع کر دے۔ نبی اکرم ﷺ نے قریب الموت لوگوں کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

☆ ادارتی معاون، شعبہ مطبوعات، قرآن اکیڈمی، لاہور۔

((لَقِّنُوْا مَوْتَاكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)) (١)

''تم اپنے قریب الموت (بھائیوں) کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کیا کرو۔''

لا الٰہ الا اللہ کا انسان کا آخری کلام ہونا بہت فضیلت کا باعث ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ)) (٢)

''جس شخص کا آخری کلام لا الٰہ الا اللہ ہو گا وہ جنت میں جائے گا۔''

ہمارے ایک استاد نے ہمیں یہ واقعہ سنایا کہ ایک بزرگ شیخ الحدیث کی درج بالا حدیث کے حوالے سے بہت خواہش تھی کہ اُن کا آخری کلام لا الٰہ الا اللہ ہو اور وہ اس کے لیے کثرت سے دعا کیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ اپنے طلبہ کو یہ حدیث پڑھا رہے تھے اور انہوں نے ابھی ''مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' پڑھا کہ اُن کی روح قبض کر لی گئی۔ ہمارے استاد کے الفاظ تھے: ان شیخ الحدیث کو ''دَخَلَ الْجَنَّةَ'' کی عملی شکل نصیب ہوئی۔ (سبحان اللہ!)

تلقین کا طریقہ: قریب الموت شخص کو کلمہ طیبہ پڑھنے کا نہیں کہنا چاہیے' اس لیے کہ اُس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوتا اور ہو سکتا ہے کہ وہ کلمہ طیبہ پڑھنے سے انکار کر دے یا کوئی ایسی بات کہہ دے جو اس کے ایمان کے حوالے سے نقصان دہ ہو۔ البتہ اس کے پاس موجود اشخاص کو خود کلمہ کا ورد کرنا چاہیے تاکہ اُن کو دیکھ کر وہ بھی کلمہ پڑھنا شروع کر دے۔

② جان کنی کے وقت سورۂ یٰسین کی تلاوت کرنا

قریب الموت شخص کا دوسرا حق یہ ہے کہ اُس کے پاس سورۂ یٰسین کی تلاوت کی جائے تاکہ اگر اُس پر ''غَمَرَاتُ الْمَوْتِ'' یعنی موت کی سختیاں ہیں تو وہ کم ہو جائیں اور اس کی روح اس کے بدن سے آسانی سے نکل کر اپنے خالق حقیقی کے پاس چلی جائے۔ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِقْرَءُوْا يٰسٓ عَلٰى مَوْتَاكُمْ)) (٣)

''تم اپنے مرنے والوں پر سورۂ یٰسٓ پڑھا کرو۔''

③ ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھنا اور اس کی فضیلت

جب کسی کی وفات کا علم ہو تو اس پر ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھنا چاہیے۔ یہ ایک طرف سے اللہ کی رضا پر راضی ہونے کی علامت ہے اور دوسری طرف اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ

اس شخص کی طرح ہم سب نے بھی اپنے خالق کے پاس چلے جانا ہے۔

احادیث میں اس کے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب کسی انسان کا بیٹا فوت ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہتے ہیں: تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کرلی؟ فرشتے کہتے ہیں: ہاں! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تم نے اس کے دل کے ثمر کو قبض کرلیا؟ فرشتے کہتے ہیں: ہاں! اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں: اس پر میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتے کہتے ہیں: اُس نے آپ کی حمد بیان کی اور اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِبْنُوْا لِعَبْدِیْ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ وَسَمُّوْہُ بَیْتَ الْحَمْدِ (٤)

''میرے بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا نام ''بیت الحمد'' رکھو!''

''اناللہ وانا الیہ راجعون'' پڑھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی فضیلت سے اللہ تعالیٰ اس سے بہتر بدل عطا فرمادیتے ہیں۔ اس حوالے سے روایات میں حضرت اُمّ سلمہ ؓ کا واقعہ مذکور ہے۔ وہ فرماتی ہیں:

''جب ابوسلمہ ؓ کا انتقال ہوا تو میں نے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور یہ دعا مانگی: اَللّٰھُمَّ اَجُرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَاخْلُفْنِیْ خَیْرًا مِنْہُ ''اے اللہ! مجھے میری اس مصیبت کا بدلہ دے اور اس سے بہتر عطا فرما''۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے دل میں سوچا کہ ابوسلمہؓ سے بہتر مجھے کون ملے گا؟...... آخر کار میری شادی نبی اکرم ﷺ سے ہوگئی۔ وہ فرماتی ہیں: فَقَدْ اَبْدَلَنِیَ اللّٰہُ بِاَبِیْ سَلَمَۃَ خَیْرًا مِنْہُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ ''مجھے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی صورت میں ابوسلمہؓ کا بہتر بدل عطا فرمادیا۔''(٥)

اس حوالے سے ہمارے ہاں یہ مشہور ہوگیا ہے کہ ''اناللہ وانا الیہ راجعون'' صرف کسی کی موت پر پڑھنا مسنون ہے' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی نقصان کی صورت میں اسے پڑھنا مسنون عمل ہے۔

④ میت کو غسل دینا

جب انسان فوت ہوجائے تو سب سے پہلے اُس کی آنکھیں بند کریں' اُس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کریں اور اُس کی ٹانگیں ساتھ جوڑ دیں۔ اس لیے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم

ٹھنڈا ہوکر اکڑ جاتا ہے اور پھر وہ جس حالت میں ہو اسی حالت میں رہتا ہے ــــــ اس کے بعد میت کو غسل دینے کا مرحلہ آتا ہے۔

آج کے اس تعلیم یافتہ دور میں دنیوی معاملات کے بارے میں تو لوگوں کو بہت علم ہے' لیکن جو بنیادی چیزیں ہیں ان کے بارے میں لوگوں کو علم نہیں ہے۔ جب کوئی شخص فوت ہوجاتا ہے تو سب اس حوالے سے پریشان ہوتے ہیں کہ میت کو غسل کون دے گا؟ ــــــ اور اب لوگوں کو اس پریشانی سے بچانے کے لیے بہت سے ایسے ادارے کھل گئے ہیں جو ایک فون کال پر آپ کے گھر آکر میت کو غسل دیتے ہیں اور کفن پہناتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ نوٹ کریں کہ میت کو غسل دینے کا زیادہ حق اس کے ورثاء کا ہے' اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ میت کو غسل دینے کے طریقے کو جانے تاکہ بوقتِ ضرورت اس کو عمل میں لایا جاسکے۔ ذیل میں میت کو غسل دینے کا طریقہ بیان کیا جارہا ہے:

غسل کا طریقہ: غسل دینے والے دو آدمی ہونے چاہئیں' ایک غسل دینے والا اور دوسرا اُس کی مدد کرنے والا اور اُن کو چاہیے کہ اپنے ہاتھوں پر دستانے پہن کر میت کو غسل دیں۔ پانی میں بیری کے پتے ڈال کر گرم کیا جائے۔ سب سے پہلے میت کو کسی تختہ' جو عموماً مساجد میں موجود ہوتا ہے' پر قبلہ رخ کرکے لٹایا جائے۔ میت کے کپڑے اتار کر اس کے ستر پر کپڑا ڈال دیا جائے۔ پھر میت کے پیٹ کو نرمی سے دبایا جائے تاکہ اگر کوئی گندگی پیٹ میں موجود ہے تو وہ نکل جائے۔ پھر میت کی شرمگاہ کو اچھی طرح دھو کر صاف کیا جائے۔ پھر میت کو وضو کرایا جائے لیکن منہ اور ناک میں پانی نہ ڈالا جائے بلکہ کپڑا یا روئی گیلی کرکے پہلے منہ' دانت اور پھر ناک اچھی طرح صاف کی جائے اور پھر باقی وضو کرایا جائے۔ اس کے بعد میت کو بائیں پہلو پر کرکے دائیں پہلو پر پانی بہایا جائے اور پاؤں تک اچھی طرح دھو دیا جائے' پھر دائیں پہلو پر کرکے بائیں پہلو کو دھویا جائے۔ میت کو غسل دیتے وقت صابن کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ میت کے بالوں کو بھی اچھی طرح دھویا جائے۔ اس کے بعد میت کو خشک کپڑے سے صاف کیا جائے تاکہ پانی کے اثرات ختم ہوجائیں اور آخر میں میت کو کافور یا کوئی اور خوشبو لگائی جائے۔

نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق میت کو اس طرح تین یا پانچ مرتبہ غسل دینا چاہیے۔ حضرت اُمِ عطیہ ؓ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی بیٹی حضرت زینب ؓ فوت ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِغْسِلْنَهَا وِتْرًا ثَلَاثًا اَوْ خَمْسًا وَاجْعَلْنَ فِی الْخَامِسَةِ كَافُوْرًا اَوْ شَيْئًا مِنْ كَافُوْرٍ)) (۶)

"اس کو طاق یعنی تین یا پانچ مرتبہ غسل دینا اور پانچویں مرتبہ کافور یا اور کوئی خوشبو لگا لینا۔"

کافور لگانا مسنون اور مستحب عمل ہے اور اس کے کئی فوائد ہیں: (۱) اس کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے جو میت کے جسم کے لیے مفید ہوتی ہے۔ (۲) اس کی خوشبو ایسی ہے جس سے کیڑے مکوڑے میت کے جلدی قریب نہیں آتے۔

میت کو غسل دینا فضیلت کا باعث ہے: میت کو غسل دینے کا طریقہ سیکھنا ایک تو اس لیے ضروری ہے کہ یہ میت کا ورثاء کے ذمے حق ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میت کو غسل دینا فضیلت کا باعث بھی ہے۔ احادیث میں میت کو غسل دینے اور کفن پہنانے والے کو گناہوں سے ایسے پاک قرار دیا گیا ہے جیسے نومولود اپنے پیدائش کے دن گناہوں سے پاک صاف ہوتا ہے۔ حضرت علی ؓ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ غَسَّلَ مَيِّتًا وَكَفَّنَهُ وَ حَنَّطَهُ وَحَمَلَهُ وَصَلّٰى عَلَيْهِ وَلَمْ يُفْشِ عَلَيْهِ مَا رَاٰى خَرَجَ مِنْ خَطِيْئَتِهِ مِثْلَ يَوْمٍ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ)) (۷)

"جس نے میت کو غسل دیا' اس کو کفن دیا' اس کو خوشبو لگائی' اس کو کندھا دیا' اس پر نماز (جنازہ) پڑھی اور اس کے راز کو ظاہر نہیں کیا جو اُس نے دیکھا تو وہ غلطیوں (اور گناہوں) سے ایسے پاک صاف ہو جائے گا جیسے اُس کی ماں نے اُسے آج ہی جنا ہے۔"

⑤ میّت کو کفن پہنانا

میت کو غسل دینے کے بعد میت کو کفن پہنایا جائے۔ کفن کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کی ایک نصیحت یہ ہے کہ کفن سفید رنگ کا صاف ستھرا کپڑا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِلْبَسُوْا مِنْ ثِيَابِكُمُ الْبَيَاضَ فَاِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ وَكَفِّنُوْا فِيْهَا مَوْتَاكُمْ)) (۸)

"تم سفید کپڑے پہنا کرو' وہ تمہارے لیے اچھے کپڑے ہیں اور انہی میں اپنے مرنے والوں کو کفن دیا کرو۔"

کفن کے بارے میں آپ ﷺ کی دوسری نصیحت یہ ہے کہ وہ زیادہ قیمتی نہ ہو' اس لیے کفن کے لیے مہنگا نہیں بلکہ درمیانہ کپڑا ہونا چاہیے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا تَغَالَوْا فِی الْكَفَنِ فَاِنَّهُ يُسْلَبُهُ سَلْبًا سَرِيْعًا)) (۹)

"زیادہ قیمتی کفن استعمال نہ کرو' کیونکہ وہ جلدی ختم ہو جاتا ہے۔"

مستحب ہے کہ مَردوں کو تین کپڑوں میں کفن دیا جائے: (۱) بڑی چادر (لفافہ)' (۲) چھوٹی چادر اور (۳) قمیص' جبکہ عورت کو پانچ کپڑوں میں کفن دینا مستحب ہے: (۱) بڑی چادر (لفافہ)' (۲) چھوٹی چادر' (۳) قمیص' (۴) دوپٹہ (اوڑھنی)' اور (۵) سینہ بندھ۔

کفن کے حوالے سے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مجبوری کی حالت میں ایک کپڑے کا کفن بھی ہو سکتا ہے اور سفید رنگ کے علاوہ کسی اور رنگ کے کپڑے یا پرانے کپڑے کا کفن بھی دیا جا سکتا ہے۔

کفن پر دعائیہ کلمات لکھنا کیسا ہے؟ بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ کفن پر کلمۂ طیبہ' قرآنی آیات' آیت کریمہ' اور مختلف دعائیہ کلمات لکھتے ہیں' حالانکہ ایسا کرنا نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کفن پر آیات اور دوسرے کلماتِ مقدسہ لکھنے سے ان کی بے حرمتی بھی ہوتی ہے۔ اس لیے کفن پر کچھ نہیں لکھنا چاہیے۔

⑥ میت کو لے جانے میں جلدی کرنا

غسل اور کفن کے بعد میت کو جلد سے جلد نماز جنازہ کے لیے لے جانا بھی میت کا حق ہے۔ رشتہ داروں کو میت کا دیدار کرانے کے لیے بہت دیر تک انتظار کرنا مناسب نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَسْرِعُوْا بِالْجَنَازَةِ فَاِنْ تَكُ صَالِحَةً فَخَيْرٌ تُقَدِّمُوْنَهَا وَاِنْ يَّكُ سِوٰى ذٰلِكَ فَشَرٌّ تَضَعُوْنَهٗ عَنْ رِقَابِكُمْ)) (۱۰)

"جنازے کو تیز لے جایا کرو۔ اس لیے کہ اگر وہ نیک ہے تو (قبر اس کے لیے) خیر ہے جہاں تم اس کو جلدی پہنچا دو گے اور اگر اس کے سوا کوئی اور صورت ہے تو ایک برا (بوجھ تمہارے کندھوں پر) ہے تو (تم تیز چل کر جلدی) اس کو اپنے کندھوں سے اتار دو گے۔"

⑦ نمازِ جنازہ ادا کرنا

نمازِ جنازہ فرض کفایہ ہے اور چند لوگوں کے ادا کرنے سے یہ سب کی طرف سے کفایت کر جائے گا' لیکن اگر کافی تعداد میں لوگ نمازِ جنازہ پڑھیں گے اور اللہ سے اس میت کی بخشش اور بلندیٔ درجات کی دعا اور سفارش کریں گے تو یہ میت کے حق میں بھی بہتر ہوگا اور پڑھنے والے بھی اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ مَيِّتٍ تُصَلِّيْ عَلَيْهِ اُمَّةٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ يَبْلُغُوْنَ مِائَةً كُلُّهُمْ يَشْفَعُوْنَ لَهٗ اِلَّا شُفِّعُوْا فِيْهِ)) (۱۱)

''جس میت پر مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نماز پڑھے جن کی تعداد سو تک پہنچ جائے اور وہ سب اللہ کے حضور اس میت کے لیے سفارش کریں تو ان کی یہ سفارش میت کے حق میں ضرور قبول ہوگی۔''

نماز جنازہ پڑھانے کا حق دار کون؟: یہاں یہ بھی نوٹ کرلیں کہ نماز جنازہ پڑھانے کا حق دار میت کے قریبی ورثاء ہیں' بالخصوص والدین کی نمازِ جنازہ پڑھانے کا زیادہ حق دار بیٹا ہے ——اس حوالے سے یہ نوٹ کریں کہ ہمارے معاشرے میں اکثر لوگوں کو نمازِ جنازہ کا طریقہ اور جنازہ کی دعا یاد نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ نمازِ جنازہ اور اس کی دعا کو سیکھیں اور اپنے والدین اور ورثاء کی نمازِ جنازہ پڑھانے کی سعادت حاصل کریں۔

⑧ جنازے کے ساتھ جانا اور جنازے کو کندھا دینا

نمازِ جنازہ ادا کرنے کے بعد میت کو دفنانے کے لیے قبرستان لے جایا جاتا ہے۔ میت کے ساتھ قبرستان جانا اور جنازے کو کندھا دینا ایک طرف میت کا حق ہے تو دوسری طرف بہت اجر وثواب کا باعث بھی۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے جنازے کے ساتھ جانے' نمازِ جنازہ پڑھنے اور دفنانے تک میت کے ساتھ رہنے والے کو اُحد پہاڑ جتنے دو قیراط اجر وثواب کا مستحق قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ اِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا وَكَانَ مَعَهٗ حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهَا وَيَفْرُغَ مِنْ دَفْنِهَا فَاِنَّهٗ يَرْجِعُ مِنَ الْاَجْرِ بِقِيْرَاطَيْنِ كُلُّ قِيْرَاطٍ مِثْلُ اُحُدٍ' وَمَنْ صَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ اَنْ تُدْفَنَ فَاِنَّهٗ يَرْجِعُ بِقِيْرَاطٍ))(۱۲)

''جو آدمی ایمان کی صفت اور ثواب کی نیت سے کسی مسلمان کے جنازے کے ساتھ جائے اور اُس وقت تک جنازے کے ساتھ رہے جب تک کہ اُس پر نماز پڑھی جائے اور اس کے دفن سے فراغت ہو تو وہ ثواب کے دو قیراط لے کر واپس ہوگا' جس میں سے ہر قیراط گویا اُحد پہاڑ کے برابر ہوگا۔ اور جو آدمی صرف نمازِ جنازہ پڑھ کر واپس آ جائے تو وہ ثواب کا ایک قیراط لے کر واپس ہوگا۔''

جنازے کو کندھا دینے کا طریقہ اور اس کی فضیلت: ہر اچھے کام کو دائیں طرف سے

شروع کرنا فضیلت کا باعث ہے' اس لیے سب سے پہلے میت کی چارپائی کے دائیں پائے کو کندھا دیا جائے اور پھر ساتھ ساتھ پیچھے آتے ہوئے پچھلے پائے کو کندھا دیا جائے۔ اس کے بعد چارپائی کے آگے والے بائیں پائے کو کندھا دیا جائے اور پھر ساتھ ساتھ پیچھے آتے ہوئے پچھلے پائے کو کندھا دیا جائے۔ ایک دفعہ چاروں طرف کندھا دینا مسنون عمل ہے۔ اس حوالے سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ملاحظہ ہو:

مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةً فَلْيَحْمِلْ بِجَوَانِبِ السَّرِيْرِ كُلِّهَا فَاِنَّهٗ مِنَ السُّنَّةِ ثُمَّ اِنْ شَاءَ فَلْيَتَطَوَّعْ وَاِنْ شَاءَ فَلْيَدَعْ (۱۳)

''جو جنازے کے ساتھ چلے اس کو چاہیے کہ چارپائی کے ہر طرف (پائے) کو کندھا دے اس لیے کہ یہ مسنون ہے۔ پھر اگر چاہے تو مزید کندھا دے اور اگر چاہے تو نہ دے۔''

جنازے کو کندھا دینا ایک طرف میت کا حق ہے تو دوسری طرف یہ انسان کے کبیرہ گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ اس حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا قول مبارک ملاحظہ ہو:

((مَنْ حَمَلَ جَوَانِبَ السَّرِيْرِ الْاَرْبَعَ كَفَّرَ اللّٰهُ عَنْهُ اَرْبَعِيْنَ كَبِيْرَةً))(۱۴)

''جس نے جنازے کے چاروں جانب کندھا دیا تو اللہ تعالیٰ (جنازہ کو کندھا دینے کو) اس کے چالیس کبیرہ گناہوں کا کفارہ بنا دیں گے۔''

عورت کی میت کو بھی ہر شخص کندھا دے سکتا ہے' اس میں محرم' غیر محرم کا کوئی فرق نہیں ہے' البتہ عورت کی میت کو قبر میں اتارنے کی ذمہ داری محرم ہی ادا کرے گا۔

جنازے کے احترام میں کھڑا ہونا کیسا ہے؟: مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے کہ لوگ جنازہ کے احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ایسا کرنا اسلامی پہلو سے کیسا ہے؟—— احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع زمانہ میں نبی اکرم ﷺ جنازہ کے احترام میں کھڑے ہوا کرتے تھے' لیکن ایک بار جنازہ کو دیکھ کر کھڑے ہوئے تو پاس موجود ایک یہودی نے کہا کہ ہم بھی ایسا کرتے ہیں۔ اُس وقت سے نبی اکرم ﷺ نے یہودیوں کی مخالفت میں جنازہ کے لیے کھڑے ہونے سے منع فرما دیا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْمُ فِي الْجَنَازَةِ حَتّٰى تُوْضَعَ فِي اللَّحْدِ فَمَرَّ بِهٖ حَبْرٌ مِنَ الْيَهُوْدِ فَقَالَ هٰكَذَا نَفْعَلُ' فَجَلَسَ النَّبِيُّ ﷺ وَقَالَ: ((اِجْلِسُوْا خَالِفُوْهُمْ)) (۱۵)

”رسول اللہ ﷺ جنازہ کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے یہاں تک کہ میت کو لحد میں اتار دیا جاتا۔ ایک مرتبہ ایک یہودی عالم کا گزر ہوا (اور آپؐ جنازہ کے احترام میں کھڑے تھے)۔ اُس یہودی نے کہا کہ ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ پس نبی اکرم ﷺ فوراً بیٹھ گئے اور فرمایا: (جنازہ دیکھ کر) اِن کی مخالفت میں بیٹھے رہو (اور کھڑے نہ ہو)۔“

آج بھی اگر کوئی جنازہ کو دیکھ کر میت کے احترام کی نیت سے کھڑا ہو جاتا ہے تو ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے‘ لیکن اولیٰ یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے طرزِ عمل کو اپنایا جائے۔

(۹) میت کو دفن کرنا اور مٹی ڈالنا

میت کو تیار کی گئی قبر کے پاس رکھا جائے۔ اگر قبر میں کوئی چٹائی یا کپڑا اچھالیا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ پھر کوئی قریبی رشتہ دار احتیاط کے ساتھ میت کو قبر میں اتارے۔ میت کو قبر میں اتارتے وقت نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق ((بِسْمِ اللّٰہِ وَعَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ)) پڑھنا چاہیے اور اگر کسی کو یہ یاد نہ ہو تو بسم اللہ پڑھ لے۔

میت کو قبر میں اتارنے کے بعد اس پر مٹی ڈالی جاتی ہے۔ وہاں موجود لوگوں کو چاہیے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے عمل کے مطابق تین بار مٹھی بھر کر سر والی طرف مٹی ڈالیں۔ علماء کرام نے لکھا ہے کہ پہلی دفعہ ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ﴾‘ دوسری دفعہ ﴿وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ﴾‘ اور تیسری دفعہ ﴿وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى﴾ پڑھنا چاہیے۔

(۱۰) دفنانے کے بعد دعا کرنا

جب میت کو مکمل طور پر دفنا دیا جائے تو پھر وہاں موجود لوگوں کو چاہیے کہ میت کی بخشش اور اس کی استقامت کے لیے دعا گو ہوں‘ اس لیے کہ اب اُس کے اصل امتحان کا وقت شروع ہو گیا ہے۔ حضرت عثمان غنی ؓ اس حوالے سے نبی اکرم ﷺ کے معمول کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ فَقَالَ: ((اِسْتَغْفِرُوْا لِاَخِيْكُمْ وَسَلُوْا لَهُ بِالتَّثْبِيْتِ فَاِنَّهُ الْآنَ يُسْأَلُ)) (۱۶)

”نبی اکرم ﷺ جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو وہاں کچھ دیر رکتے اور فرماتے: ”اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو اور اس کے لیے ثابت قدمی کی دعا کرو‘ اس لیے کہ اِس وقت اُس سے سوال کیا جا رہا ہے۔“

اس کے علاوہ بھی ورثاء اور خاص طور پر اولاد کو چاہیے کہ وہ اپنے والدین کی بخشش کے

لیے ہر وقت دعا گو ہوں اور نیک کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں‘ اس لیے کہ اولاد کے نیک اعمال کا ثواب فوت شدہ والدین کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جاتا ہے۔

(۱۱) میت کے لواحقین سے تعزیت کرنا

تعزیت کا عام فہم معنی یہ ہے کہ میت کے لواحقین اور اس کے اہل خانہ کو تسلی دینا اور ایسے کلمات کہنا جن کو سن کر اُن کا صدمہ کچھ کم ہو جائے۔ تعزیت کرنا بھی زندہ لوگوں کے ذمے ایک فرض ہے جس کی بہت فضیلت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ مُؤْمِنٍ يُعَزِّيْ اَخَاهُ بِمُصِيْبَةٍ اِلَّا كَسَاهُ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ مِنْ حُلَلِ الْكَرَامَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (۱۷)

”جو کوئی اپنے مؤمن بھائی کی مصیبت پر تعزیت کرے گا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے قیامت کے روز عزت کا تاج پہنائے گا۔“

ہمارے معاشرے میں تعزیت بھی صرف رسماً کی جاتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ تعزیت کو میت کا حق سمجھ کر کریں تاکہ مذکورہ اجر کے حق دار بن سکیں۔

(۱۲) میّت کے ذمّے واجب الادا قرض کو ادا کرنا

میت کی تدفین اور باقی معاملات سے فراغت کے بعد ورثاء کو چاہیے کہ میت کے ذمے اگر کوئی قرض ہے تو اس کی جلد ادائیگی کی فکر کریں۔ اس لیے کہ جب تک قرض ادا نہیں ہو جاتا انسان کی روح معلق رہتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے‘ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهٖ حَتّٰى يُقْضٰى عَنْهُ)) (۱۸)

”مؤمن کی روح اس وقت تک معلق رہتی ہے جب تک اس کا قرض ادا نہ کر دیا جائے۔“

قرض ادا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر قرض ادا نہ کیا گیا تو قیامت کے دن اس قرض کے بدلے میں اِس میت کی نیکیاں لے لی جائیں گی اور اس طرح مقروض صرف قرض ادا نہ کرنے کی وجہ سے جنت سے محروم کر دیا جائے گا۔ اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ فَارَقَ الرُّوْحُ الْجَسَدَ وَهُوَ بَرِیْءٌ مِنْ ثَلَاثٍ دَخَلَ الْجَنَّةَ: مِنَ الْكِبْرِ وَالْغُلُوْلِ وَالدَّيْنِ)) (۱۹)

”جس کی روح اُس کے جسم سے اس حال میں جدا ہوئی کہ وہ تین چیزوں (۱) تکبر (۲) دھوکہ دہی اور (۳) قرضہ سے بچا رہا تو وہ جنت میں داخل ہو گیا۔“

۱۳ میت کی طرف سے حج کرنا

ایک قرض تو مال و دولت کا ہوتا ہے اور ایک قرض ''نذر'' بھی ہے۔ اگر کسی نے کوئی نذر مانی اور وہ نذر پوری کرنے سے پہلے فوت ہو گیا تو اس کے ورثاء پر لازم ہے کہ وہ اُس نذر کو پورا کریں۔ مثلاً اگر کسی نے حج کرنے کی نذر مانی' لیکن وہ حج کرنے سے پہلے ہی وفات پا گیا تو اب اس کے ورثاء پر لازم ہے کہ وہ اُس کی اِس نذر کو پورا کریں۔ اس لیے کہ یہ بھی میت کے ذمے قرض ہے جسے ادا کرنا ورثاء پر لازم ہے۔

''حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ جہینہ کی ایک عورت نبی اکرمؐ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی لیکن وہ حج کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((نَعَمْ حُجِّيْ عَنْهَا' اَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلٰى اُمِّكِ دَيْنٌ اَكُنْتِ قَاضِيَةً؟ اقْضُوا اللّٰهَ فَاللّٰهُ اَحَقُّ بِالْوَفَاءِ)) (۲۰)

''ہاں' اس کی طرف سے حج کرو۔ تیرا کیا خیال ہے کہ اگر تیری ماں پر کوئی قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا نہیں کرتی؟ (یہ نذر اللہ کا قرض ہے' لہٰذا) اللہ کا قرض ادا کرو' اس لیے کہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اس کا قرض ادا کیا جائے۔''

اس کے علاوہ اگر نذر نہ بھی مانی ہو تب بھی اولاد اپنے والدین یا قریبی رشتہ دار کی طرف سے حج کر سکتی ہے' اس کا اجر و ثواب ان شاء اللہ تعالیٰ میت کو ضرور پہنچے گا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے انسان اپنا فرض حج ادا کرے اور بعد میں والدین یا رشتہ دار کی طرف سے حج یا عمرہ کرے۔

''حضرت عبداللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر قبیلہ خثعم کی ایک عورت نبی اکرم ﷺ کے پاس آئی اور اس نے کہا کہ اللہ نے اپنے بندوں پر حج فرض کیا ہے۔ میں نے اپنے بوڑھے باپ کو اس حال میں پایا کہ وہ سواری پر بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ میں اُس کی طرف سے حج کروں تو کیا اس کا فرض ادا ہو جائے گا؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((نَعَمْ)) ''ہاں (ہو جائے گا)۔'' (۲۱)

۱۴ میت کے قضا روزوں اور نمازوں کا فدیہ ادا کرنا

علماء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص نے روزہ رکھنے کی نذر مانی اور روزہ رکھنے سے پہلے وفات پا گیا تو اس کے ورثاء نذر کے روزوں کو بالفعل رکھ سکتے ہیں' لیکن رمضان کے فرض

روزوں اور فرض نمازوں کو بالفعل ادا نہیں کر سکتے۔ ورثاء کے لیے اگر ممکن ہو تو حساب کر کے میت کی طرف سے فی روزہ اور فی نماز صدقہ فطر کے برابر فدیہ ادا کریں۔ اس حوالے سے مولانا محمد یوسف لدھیانوی کا جواب ملاحظہ ہو:

''فرض نماز اور روزہ ایک شخص دوسرے کی طرف سے ادا نہیں کر سکتا' البتہ نماز روزے کا فدیہ مرحوم کی طرف سے اس کے وارث ادا کر سکتے ہیں۔ پس اگر آپ اپنی والدہ کی طرف سے نمازیں قضا کرنا چاہتی ہیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس گنجائش ہو تو ان کی نمازوں کا حساب کر کے ہر نماز کا فدیہ صدقہ فطر کے برابر ادا کریں۔ وتر کی نماز سمیت ہر دن کی نمازوں کے چھ فدیے ہوں گے۔ ویسے آپ نوافل پڑھ کر اپنی والدہ کو ایصالِ ثواب کر سکتی ہیں۔'' (۲۲)

۱۵ میت کی طرف سے صدقہ وخیرات کرنا

فوت شدہ قریبی رشتہ داروں اور خاص طور پر فوت شدہ والدین کی طرف سے صدقہ وخیرات کرنا فوت شدگان کے لیے بھی باعث ثواب ہے اور صدقہ وخیرات کرنے والے کے حق میں بھی باعث برکت ہے۔

''حضرت سعد بن عبادہ ؓ کی والدہ کا ان کی عدم موجودگی میں انتقال ہو گیا۔ (جب وہ واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر گزارش کی:) یا رسول اللہ! میری والدہ نے میری غیر حاضری میں وفات پائی' اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا انہیں کوئی نفع پہنچے گا؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''ہاں' پہنچے گا''۔ انہوں نے عرض کیا: آپؐ گواہ رہیں' میں نے اپنا مخراف نامی باغ ان کی طرف سے صدقہ کر دیا۔'' (۲۳)

اسی طرح اور بھی بہت سی روایات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ صدقہ وخیرات کا اجر و ثواب فوت شدگان کو پہنچتا ہے۔

۱۶ عورت کا عدت گزارنا

میت کے لیے تین دن سے زیادہ سوگ منانا جائز نہیں ہے' البتہ عورت کے لیے اپنے خاوند کی وفات پر عدت گزارنا لازم ہے اور یہ میت کا حق بھی ہے۔ عدت کے حوالے سے یہ نوٹ کر لیں کہ عورت اگر حاملہ ہے تو اُس کی عدت وضع حمل یعنی بچے کی پیدائش ہے اور اگر وہ حاملہ نہیں ہے تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ اس مدت میں وہ گھر میں سادگی اختیار

کرتے ہوئے رہے اور بغیر کسی مجبوری اور شرعی عذر کے گھر سے باہر نہ نکلے۔ اگر مجبوری کے وقت گھر سے باہر جانا بھی پڑے تو سادگی اور پردہ کا خصوصی لحاظ رکھے۔

عدت گزارنے کے بعد اب عورت کو عقدِ ثانی کا اختیار حاصل ہے‘ اس سلسلے میں رشتہ داروں کو اسے کسی بات پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔

نتیجہ کلام

پیدائش‘ شادی اور وفات انسانی زندگی کے تین اہم مراحل ہیں اور ان مراحل کے حوالے سے کچھ رسومات اور افعال ایسے ہیں جو دین اسلام سے ثابت ہیں‘ جبکہ کچھ رسومات اور افعال ایسے ہیں جنہیں مسلم معاشروں نے ہندوانہ تہذیب سے مستعار لیا ہے۔ ان کے بارے میں قاعدہ یہی ہے کہ جو افعال اسلامی پہلو سے ثابت ہیں اُن کو اپنایا جائے اور جن کا ثبوت نہیں ملتا اُن سے کنارہ کشی کر لی جائے۔

اس ضمن میں خصوصی طور پر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ پیدائش اور شادی خوشی کے ذرائع ہیں اور ان مواقع پر جو رسومات ادا کی جاتی ہیں وہ بھی خوشی کے اظہار کے لیے ہوتی ہیں نہ کہ کسی ثواب کی غرض سے‘ اس لیے اُن کا شمار ’’بدعت‘‘ میں نہیں ہوتا۔ البتہ ان مواقع پر بھی اسراف وتبذیر سے کلیتاً اجتناب ضروری ہے۔ تاہم وفات کے موقع پر کیے جانے والے چند افعال ایسے بھی ہیں جو ثواب کی غرض سے کیے جاتے ہیں اور وہ افعال نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت نہیں ہیں‘ اس لیے ایسے افعال ’’بدعت‘‘ شمار ہوں گے — اور بدعت کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا یہ قول ہمیشہ ذہن میں رہنا چاہیے جو آپؐ جمعہ کے خطبہ میں پڑھا کرتے تھے:

((......شَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا وَکُلُّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ وَکُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَکُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ))(۲۴)

’’...... بدترین کام (دین میں) نئی چیز پیدا کرنا ہے اور ایسی ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ (میں لے جانے کا باعث) ہے۔‘‘

حواشی

(۱) سنن الترمذی‘ کتاب الجنائز‘ باب ما جاء فی تلقین المریض عند الموت۔

(۲) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الجنائز‘ باب فی التلقین۔

(۳) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الجنائز‘ باب القراءۃ عند المیت۔

(۴) سنن الترمذی‘ کتاب الجنائز‘ باب فضل المصیبۃ اذا احتسب۔ قال ابو عیسیٰ ھذا حدیث حسن غریب۔ ومسند احمد‘ ح ۱۸۸۹۳۔

(۵) مسند احمد‘ ح ۱۵۷۵۱۔

(۶) صحیح مسلم‘ کتاب الجنائز‘ باب فی غسل المیت۔

(۷) سنن ابن ماجہ‘ کتاب ماجاء فی الجنائز‘ باب ماجاء فی غسل المیت۔

(۸) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الطب‘ باب فی الامر بالکحل۔ وسنن الترمذی‘ کتاب الجنائز‘ باب ما یستحب من الاکفان۔

(۹) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الجنائز‘ باب کراھیۃ المغالاۃ فی الکفن۔

(۱۰) صحیح البخاری‘ کتاب الجنائز‘ باب السرعۃ بالجنازۃ۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الجنائز‘ باب الاسراع بالجنازۃ۔

(۱۱) صحیح مسلم‘ کتاب الجنائز‘ باب من صلی علیہ مائۃ شفعوا فیہ۔

(۱۲) صحیح البخاری‘ کتاب الایمان‘ باب اتباع الجنائز من الایمان۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الجنائز‘ باب فضل الصلاۃ علی الجنازۃ واتباعھا۔

(۱۳) سنن ابن ماجہ‘ کتاب ما جاء فی الجنائز‘ باب ما جاء فی شھود الجنائز۔

(۱۴) مجمع الزوائد للھیثمی‘ ج ۳‘ ص ۲۶۔ راوی: انس بن مالک ؓ۔

(۱۵) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الجنائز‘ باب القیام للجنازۃ۔

(۱۶) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الجنائز‘ باب الاستغفار عند القبر للمیت فی وقت الانصراف۔

(۱۷) سنن ابن ماجہ‘ کتاب ما جاء فی الجنائز‘ باب ما جاء فی ثواب من عزی مصابا۔

(۱۸) سنن ابن ماجہ‘ کتاب الاحکام‘ باب التشدید فی الدّین۔

(۱۹) سنن ابن ماجہ‘ کتاب الاحکام‘ باب التشدید فی الدّین۔

(۲۰) صحیح البخاری‘ کتاب الحج‘ باب الحج والنذور علی المیت والرجل یحج عن المرأۃ۔

(۲۱) صحیح البخاری‘ کتاب الحج‘ باب الحج عمن لا یستطیع الثبوت علی الراحلۃ۔

(۲۲) آپ کے مسائل اور ان کا حل‘ ج ۳‘ ص ۱۴۷۔

(۲۳) صحیح البخاری‘ کتاب الوصایا‘ باب اذا قال ارضی او بستانی صدقۃ للّٰہ عن امی......

(۲۴) سنن النسائی‘ کتاب صلاۃ العیدین‘ باب کیف الخطبۃ۔

پاکستان کی موجودہ حالتِ زار

سورۂ ابراہیم کی آیات کی روشنی میں

محمد نذیر یٰسین

قرآن حکیم کی تلاوت سنتے ہوئے ایک روز راقم الحروف کی توجہ سورۂ ابراہیم کے ان الفاظ پر مرکوز ہو کر رہ گئی:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝۲۸﴾

''کیا آپ ﷺ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کے بدلے میں ناشکری کی اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لا اُتارا؟''

ذرا غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں تو گویا پاکستان کی موجودہ صورتحال کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔ بعد ازاں اس کے بعد کی آیات اور پھر پوری سورۂ ابراہیم کے مضامین پر غور و فکر سے اس سورۂ مبارکہ کی پاکستان کے موجودہ حالات کے ساتھ ایک خاص نسبت نظر آئی تو قرآن حکیم کے ایک کتابِ زندہ اور ابدی رہنمائی کے سرچشمہ ہونے کا یقین مزید پختہ ہو گیا۔ اسی حقیقت کا اظہار اس سورہ کی پہلی آیت میں بھی کیا گیا ہے کہ یہ قرآن حکیم لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جانے والی کتاب ہے۔

پاکستان کی موجودہ تباہی کا ذمہ دار کون؟

پاکستان کی موجودہ صورتحال کے حوالے سے یہ بحث بہت عام ہے کہ آخر اس زوال اور تباہی و بربادی کے اسباب کیا ہیں؟ اور اس کے ذمہ دار کون لوگ یا کون سے طبقات ہیں؟ کوئی اس کا ذمہ دار فوجی آمروں کو قرار دیتا ہے تو کوئی سیاستدانوں کو۔ کسی کے نزدیک یہ سب افسر شاہی کا کیا دھرا ہے اور کوئی ملاؤں و مذہبی انتہا پسندوں کو اس کا ذمہ دار گردانتا ہے۔ ایک بڑے طبقے کے نزدیک عدلیہ کا نظریہ ضرورت ان تمام خرابیوں کی جڑ و بنیاد تھا' لہٰذا وہ وکلاء تحریک کی

کامیابی کے بعد موجودہ عدلیہ سے غیر معمولی توقعات وابستہ کیے بیٹھا ہے۔

پاکستان کو موجودہ حالتِ زار تک پہنچانے کی ذمہ داری اگرچہ کسی نہ کسی درجے میں ہر پاکستانی پر عائد کی جا سکتی ہے مگر حصہ بقدر جثہ کے مصداق اس کی زیادہ ذمہ داری اُن طبقات پر عائد ہوتی ہے جو اس وقت ریاستی عہدوں پر براجمان ہیں یا ماضی میں رہے ہیں اور یا پھر معاشرے میں غیر معمولی اثر و رسوخ کے حامل ہیں۔ تاہم کسی ایک طبقے یا طبقات کو موجودہ بدحالی کا ذمہ دار قرار دے دینا ہمارے مسائل اور باہمی تقسیم و انتشار میں اضافے کا باعث تو بن سکتا ہے مگر موجودہ بحرانی صورتحال سے نکلنے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

ہماری تباہی کی وجہ بننے والی ذہنیت

ہماری اصل ضرورت اُس ذہنیت کو سمجھنا اور اسے بدلنا ہے جس نے ہمیں موجودہ انجامِ بد سے دوچار کر رکھا ہے۔ اپنی ہی قوم کو تباہی کے دہانے پر پہنچانے والے لوگوں کی بدعقیدگی و بیمار ذہنیت کو سورۂ ابراہیم کی آیت ۳۰ میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ۝۳۰﴾

''اور انہوں نے اللہ کے ہمسر اختیار کر لیے تاکہ اُس کے راستے سے لوگوں کو بھٹکا دیں۔ آپ ﷺ فرما دیجیے کہ (دنیا میں) مزے اڑا لو' پھر آخر کار تمہیں جہنم کی طرف ہی پلٹنا ہے۔''

اس آیہ مبارکہ میں واضح طور پر کسی قوم کی تباہی کا سبب اللہ ربّ العزت کی ہمسری اختیار کرنا قرار دیا گیا ہے۔ مزید برآں ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ کے قرآنی الفاظ کی رو سے ہم بخوبی جانتے ہیں کہ حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے' مگر ہم یہ بات عملاً ماننے پر آمادہ نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو آج ہمارے ہاں یہ بحث نہ چل رہی ہوتی کہ پارلیمنٹ اور عدلیہ میں سے کس ادارے کو سپریم اتھارٹی حاصل ہے؟ جو لوگ دستور پاکستان کو سب سے بالاتر قرار دے کر بظاہر اس بحث سے جان چھڑاتے ہیں' وہ اس حقیقت کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں کہ دستورِ پاکستان میں تو اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ذاتِ باری تعالیٰ کو تسلیم کیا گیا ہے' جس کا منطقی و لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ یہاں ہر قسم کی قانون سازی قرآن و سنت کے مطابق ہو۔ دین اللہ کی سپریم اتھارٹی کو عملاً تسلیم کر کے اس کے مطابق قانون سازی نہ کرنا' اسے نہ ماننے یا بالفاظِ دیگر اللہ کی ہمسری کرنے کے مترادف ہی قرار پاتا ہے۔

قول وفعل کا تضاد ٔہمارا طرّہ امتیاز

اگر کسی بات کا زبان سے اقرار کیا جائے مگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو یہ قول وفعل کا تضاد کہلاتا ہے اور قول وفعل کا یہ تضاد ہی پاکستانی قوم کا اصل روگ ہے۔ ہمارے بارے میں اس کا اظہار تو پوری دنیا کب سے کر رہی ہے‘ مگر آج ہمارے دانشوروں کی عظیم اکثریت بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو چکی ہے۔ اس مرض کو دیگر الفاظ میں دوعملی‘ دورخی‘ ڈبل گیم یا نفاق بھی کہا جاتا ہے اور اس کے لیے منافقت کا عام فہم لفظ زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اسی مرض منافقت کا نتیجہ ہے کہ آج ہماری فوج بظاہر ملکی سرحدوں کی محافظ بھی ہے اور عالمی سامراجی قوتوں کی آلۂ کار بھی۔ ہمارے سیاستدان عوام کی نمائندگی وخدمت کے دعویدار بھی ہیں اور اُن کا خون نچوڑنے والے بھی۔ ہمارے مذہبی رہنما‘ اسلام اور جہاد کے چیمپئن بھی ہیں اور ہماری فرعون صفت اسٹیبلشمنٹ کی آنکھوں کا تارا بھی۔ پاکستانیوں سے زیادہ مظلوم قوم دنیا میں کوئی اور نہیں ہے تو ان سے زیادہ بدنام زمانہ بھی کوئی نہیں ہے۔ پاکستان کے دستور کا تضاد اور اس کی دورُخی بھی سب پر واضح ہے‘ لہٰذا دستورِ پاکستان کو بجا طور پر ہماری اجتماعی منافقت اور قومی تضادات کی اہم ترین علامت قرار دیا جاسکتا ہے۔

سورۂ ابراہیم کی جو آیت ان سطور کی تحریر کا باعث بنی ہے‘ اس سے ماقبل کی آیات ۲۴ تا ۲۷ میں ایک کلمۂ پاکیزہ اور ایک کلمۂ خبیثہ کی مثال بیان کی گئی ہے۔ کلمۂ پاکیزہ کی مثال ایک ایسے پاکیزہ درخت کی سی ہے جس کی جڑ مضبوط ہو‘ اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں اور وہ باذنِ ربی ہر وقت پھل لاتا رہتا ہو‘ جبکہ کلمۂ خبیثہ کو ایک ایسے شجر خبیثہ سے تشبیہ دی گئی ہے جسے کچھ ثبات وقرار حاصل نہ ہو اور اسے بآسانی اکھاڑا جاسکتا ہو۔ اگر دستورِ پاکستان میں قراردادِ مقاصد اور کچھ دیگر اسلامی دفعات شامل نہ ہوتیں تو اسے ایک کلمۂ خبیثہ قرار دینے میں کوئی چیز مانع نہ ہو سکتی تھی‘ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ دستور کلمۂ پاکیزہ کے معیار پر ہرگز ہرگز پورا نہیں اترتا۔ جو دینی رہنما ہر وقت ۱۹۷۳ء کے آئین کا حوالہ دے کر اسے ایک مقدس صحیفہ ثابت کرتے رہتے ہیں اُن کی عقلوں پر ماتم ہی کیا جاسکتا ہے۔ آخر حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ نہ کرنے کا قرآنی حکم کیا معانی رکھتا ہے؟ کفر وایمان کے بیچ کی اس حالت کو سوائے نفاق کے اور کیا نام دیا جاسکتا ہے؟ قرارداد مقاصد کی شمولیت کی بنا پر انگریز کے چھوڑے ہوئے نظام کو اسلامی نظام کہنا بذاتِ خود منافقت کی انتہا ہے۔

منافقت کے روگ کی اصل وجہ

یہ منافقت‘ یہ دوعملی اور یہ دورُخے پن کا روگ‘ پوری قوم کی رگ وپے میں کیسے اور کیونکر سمایا؟ اس اہم وبنیادی سوال کا جواب سورۂ ابراہیم کی ابتدا میں ہی بیان کر دیا گیا ہے:

﴿الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝۳﴾

’’جو لوگ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو محبوب رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں (یعنی خود بھی اللہ کی راہ سے رُکتے ہیں اور لوگوں کو روکنے کا باعث بھی بنتے ہیں) اور اس راہ کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں‘ وہی لوگ پرلے درجے کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔‘‘

اس آیۂ مبارکہ اور پاکستانی قوم کے عمومی رویے سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ دنیا کی محبت ہمارے دلوں میں مکمل طور پر گھر کر چکی ہے۔ مغربی تہذیب کی چکاچوند نے ہمیں اس قدر متاثر و مرعوب کر رکھا ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات کو دقیانوسی یا موجودہ دور میں ناقابل عمل قرار دے کر اُن میں من مانی ترامیم کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا کے ساتھ چلنے کے نام پر سود‘ جوئے اور بے پردگی کو عملاً حلال کر لیا گیا ہے‘ جبکہ رشوت‘ بدعنوانی‘ ملاوٹ‘ جھوٹ اور دھوکہ دہی کی لعنتیں‘ دن بدن قوم کے ہر فرد کے رگ وپے میں سرایت کرتی چلی جا رہی ہیں۔

سبھی جانتے ہیں کہ اسلام کا اصل سیاسی نظام‘ نظام خلافت ہے‘ مگر ہمارے دینی رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ مروّجہ مغربی جمہوریت سے محبت وعقیدت اور اس سے وابستہ ذاتی وطبقاتی مفادات اُنہیں اس قدر عزیز ہو چکے ہیں کہ آج اسلام کے اصل نظام (نظام خلافت) کا نام بھولے سے بھی اُن کی زبانوں پر نہیں آتا ہے۔ اگر اکثریت کی حکمرانی کے تصور پر مبنی‘ مروّجہ اخلاق باختہ اور سرمایہ دار طبقے کے گھر کی لونڈی‘ یہ نام نہاد جمہوریت ہی انسانیت کے تمام مسائل کا حل ہوتی تو اللہ تبارک وتعالیٰ قومِ نوحؑ ‘ قومِ عاد وثمود‘ قومِ لوطؑ‘ قومِ شعیبؑ‘ آلِ فرعون اور اہلِ یونان وغیرہ بے شمار اقوام کو تباہ وبرباد فرما کر اُنہیں رہتی دنیا تک عبرت کا نشان نہ بناتے۔

کارِ رسالت اور ہماری دینی جماعتیں

اسی حوالے سے ہماری دینی قیادت وسیادت کا ایک اور المیہ یہ بھی ہے کہ وہ کارِ نبوت اور کارِ رسالت کا فرق سمجھنے سے قاصر دکھائی دیتی ہے۔ ایک طویل تاریخی بُعد وخلا کی وجہ سے وہ

ان دونوں کو ایک ہی عمل سمجھے چلی جا رہی ہے‘ درآں حالیکہ ان دونوں کے نہ صرف تقاضے مختلف ہیں بلکہ یہ دونوں کام دو مختلف قسم کے حالات میں سرانجام دیے جاتے ہیں۔

کارِ نبوت ایک مسلسل جاری رہنے والا عمل ہے‘ جس کا مقصد پہلے سے اسلامی اصولوں پر استوار شدہ کسی معاشرے کی اصلاح و تربیت کا کام سرانجام دینا ہوتا ہے‘ جبکہ کارِ رسالت کی ضرورت اُس وقت پیش آتی ہے جب کوئی معاشرہ اخلاقی زوال و پستی کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اُس کی تشکیلِ نو کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔

اگرچہ نبوت و رسالت حضور نبی کریم ﷺ پر ختم ہو چکی ہے‘ مگر کارِ نبوت و رسالت کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ جب تک اُمت کے اندر اسلامی نظام قائم تھا تو اُس وقت ضرورت صرف اس کی اصلاح و حفاظت تک محدود تھی‘ جسے کارِ نبوت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے‘ تاہم خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد اُمتِ مسلمہ کی اصل ضرورت و ترجیح اوّل اُس نظام کو از سرِ نو قائم کرنا بن چکی ہے۔ چونکہ آج اُمتِ مسلمہ کی آبادی بہت بڑھ چکی ہے اور وہ بے شمار ریاستوں میں بھی بٹ چکی ہے‘ لہٰذا پوری اُمت کی تشکیل نو اور اسے دوبارہ ایک حقیقی اسلامی معاشرے میں ڈھالنے کا کام یکا یک ممکن نہیں ہوسکتا۔ یہ کارِ عظیم اگرچہ پوری اُمت کے اندر کسی نہ کسی انداز میں مسلسل جاری ہے مگر ایک حقیقی‘ مکمل اور ہمہ گیر اسلامی انقلاب کا آغاز کسی ایک مسلم ملک ہی سے ہو سکے گا‘ جس کے بعد اس میں بتدریج توسیع ہوتی چلی جائے گی اور مسلمان ماضی کی طرح دوبارہ ایک اُمت واحدہ کی شکل اختیار کر لیں گے۔

پاکستانی معاشرہ‘ انقلاب کے دہانے پر

پاکستان کا شمار اُن اہم ترین اسلامی ممالک میں ہوتا ہے جن کے بارے میں اہلِ علم کا خیال ہے کہ وہاں ایک حقیقی اسلامی معاشرے کے قیام یا بالفاظِ دیگر ایک کامل اسلامی انقلاب کے وقوع پذیر ہونے کا امکان سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ قرآن حکیم اور دیگر تاریخی آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ جو معاشرہ تشکیلِ نو کے مرحلہ سے گزر رہا ہوتا ہے‘ وہاں ایک واضح معاشرتی تقسیم (polarization) اور محاذ آرائی (confrontation) کی کیفیت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ آج عالمِ اسلام میں صرف پاکستان ہی وہ ملک ہے جہاں یہ تقسیم و محاذ آرائی نہ صرف بالکل واضح ہے بلکہ اس میں دن بدن اضافہ بھی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اگرچہ اسلام اور سیکولرازم کی یہ جنگ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی شروع ہوگئی تھی‘ تاہم نائن الیون کے بعد یہ حتمی مرحلے میں

داخل ہوگئی تھی اور اب یہ جلد ہی اپنے اختتام کو پہنچتی دکھائی دے رہی ہے۔ اسلام اور سیکولرازم کی اس جنگ میں پاکستان کی تمام ہی دینی قوتیں اپنی اپنی سوچ اور اپنی اپنی بساط کے مطابق حصہ ڈال رہی ہیں‘ جس کے مثبت نتائج جلد یا بدیر‘ ان شاء اللہ‘ اسلام کے حق میں ہی برآمد ہوں گے۔

سچ تو یہ ہے کہ کسی معاشرے کی تشکیل نو (بالخصوص اسلامی خطوط پر) ایک مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے‘ جس کے لیے بہت کٹھن و صبر آزما جدّوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس جدّوجہد کو معاشرے کی طرف سے بالعموم اور اس کے مراعات یافتہ طبقے کی طرف سے بالخصوص‘ شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے لہٰذا اس حوالے سے قدرت کا ایک اٹل فیصلہ بھی نافذ ہوا کرتا ہے‘ اور وہ فیصلہ تشکیل نو کی مخالف قوتوں کی نابودی کا ہوتا ہے۔ اُن کی نابودی کا یہ فیصلہ مختلف ادوار میں مختلف صورتوں میں نافذ ہوتا رہا ہے‘ کبھی اُن پر ارضی و سماوی آفات کے نزول کی صورت میں اور کبھی میدانِ جنگ میں اُنہیں شکست فاش سے دوچار کرنے کی صورت میں۔

کارِ رسالت کی خصوصیات و مراحل

سورۂ ابراہیم میں نہ صرف عذابِ ہلاکت سے دوچار ہونے والی کئی اقوام (قومِ موسیٰؑ، قومِ نوحؑ اور قومِ عاد و ثمود) کی مثالیں بیان کی گئی ہیں‘ بلکہ کارِ رسالت کی کچھ خصوصیات و مراحل اور رسولوں کو درپیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے‘ جن کی تفصیل ذیل میں بیان کی جا رہی ہے:

(۱) کارِ رسالت کی ایک اہم خصوصیت آیت ۴ میں یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ اُس قوم کی اپنی زبان میں ادا کیا جاتا ہے تاکہ اُس پر حق کو بالکل واضح و مبرہن کر دیا جائے۔ اس نکتہ کا پاکستان پر اطلاق کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی بھی ملک کی نسبت یہاں دینِ حق کا پیغام زیادہ وسیع و ہمہ گیر پیمانے پر پھیلا ہے۔ یہاں نہ صرف قرآن کے انقلابی پیغام کی دعوت بڑے پیمانے پر عام ہوئی ہے بلکہ قرآن کے سب سے زیادہ تراجم بھی اردو زبان میں ہی کیے گئے ہیں اور سب سے زیادہ تبلیغی و دعوتی سرگرمیاں بھی یہیں سرانجام دی جا رہی ہیں۔

(۲) سورۂ ابراہیم کی آیت ۶ میں جلیل القدر پیغمبر‘ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات کا تذکرہ کیا گیا ہے‘ جس سے ثابت ہوا کہ جس قوم کی تشکیلِ نو درکار ہوتی ہے‘ اُس پر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی بارشیں خاص طور پر نازل فرماتا ہے تاکہ اُس قوم میں

اپنے رب کی احسان مندی و شکر گزاری کا جذبہ اچھی طرح گھر کر سکے‘ جیسا کہ یہی بات سورۃ القریش اور سورۃ الفیل کے حوالے سے اہلِ مکہ کے بارے میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اس نکتہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پاکستان کا معجزانہ قیام‘ اب تک بقا اور بڑے بڑے بحرانوں سے باہر نکل آنا‘ یہ سب اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم کا نتیجہ ہے‘ وگرنہ ہم نے تو اپنی بداعمالیوں سے اسے تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رکھی ہے۔ دوسری طرف ہماری احسان فراموشی کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ پاکستان کو ایٹمی قوت بنا کر ناقابلِ تسخیر بنانے والے محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو اُنہی سیکیورٹی اداروں نے پابند سلاسل کیا جنہیں اس ایٹمی صلاحیت کی بدولت غیر معمولی تقویت حاصل ہوئی۔ ایسی قومی احسان فراموشی کی مثال سوائے پاکستان کے دنیا میں کہیں اور نہیں مل سکتی ہے۔

ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ جو شخص اپنے محسن کا شکر گزار نہیں ہوتا وہ اللہ کا شکر گزار بھی نہیں بن سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے بے شمار احسانات اور نوازشوں کے باوجود اُس کی شکر گزاری کے حقیقی تقاضے ادا نہ کرنے کی وجہ سے ہی آج ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے طرح طرح کے عذابوں میں گھرتے چلے جا رہے ہیں‘ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝۷﴾ (ابراهیم)

’’اگر تم شکر گزاری کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ عطا کروں گا‘ اور اگر تم ناشکری کرو گے تو پھر یقیناً میرا عذاب بھی بہت سخت ہے۔‘‘

اس آیہ مبارکہ میں عذاب کی جو وعید سنائی گئی ہے‘ اس کا تعلق آخرت کے عذاب سے تو ہے ہی‘ مگر اس سے مراد دنیا میں نازل ہونے والا وہ عذابِ ہلاکت بھی ہے جو اُس قوم پر نازل کیا جاتا ہے جن کی طرف رسولوں کو مبعوث کیا جاتا ہے۔ یہ عذابِ الٰہی یکا یک نازل نہیں ہوا کرتا بلکہ اُس سے پہلے بطور تنبیہہ‘ بے شمار چھوٹے چھوٹے عذاب بھی نازل کیے جاتے ہیں۔ پاکستانی قوم کا آئے روز کسی نہ کسی آفت میں مبتلا ہوتے رہنا‘ یہاں پر کارِ رسالت کے جاری و ساری ہونے پر واضح دلالت کرتا ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ!

(۳) جب بھی کسی معاشرے میں کارِ رسالت کا آغاز کیا جاتا ہے تو معاشرتی تشکیل نو کے اس پیغام کے متعلق پہلے پہل اُس معاشرے کا عمومی رویہ بے اعتنائی و بے رُخی کی صورت میں

سامنے آتا ہے۔ اوّل تو اُس کا کوئی خاص نوٹس ہی نہیں لیا جاتا اور اگر کوئی اس بارے میں ریمارکس دیتا بھی ہے تو وہ اُس پیغام کی یکسر نفی پر مبنی ہوتے ہیں۔

سورۃ ابراہیم کی آیت ۹ میں اس طرزِ عمل کو ’’اپنے ہاتھوں کو اپنے مونہوں میں دبا لینے‘‘ سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ جب کارِ رسالت سرانجام دینے والے اس صورتحال پر بددل ہونے کی بجائے اپنے پیغام و موقف کا اعادہ جاری رکھتے ہیں تو اُنہیں عام انسان (یعنی معاشرے کی مروّجہ نام نہاد حکمت و دانش سے تہی دامن اور سطحی سوچ رکھنے والے) قرار دے کر اپنے آباء واَجداد کی ضد و مخالفت کرنے کا الزام بھی لگا دیا جاتا ہے۔ جب اُن کے اعلیٰ کردار و شائستہ ردّعمل کی بدولت کردار کشی کی اس مہم کا بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا تو پھر کارِ رسالت ادا کرنے والوں سے طرح طرح کے دلائل و براہین طلب کیے جاتے ہیں۔ اُن کی سچائی کی تصدیق کے لیے کچھ خرقِ عادت معجزات و کارنامے دکھانے کا مطالبہ بھی کیا جاتا ہے۔ ان دلائل‘ براہین‘ معجزات اور کارناموں کی فرمائش کی وجہ اپنے اَسلاف سے منسوب ایسی غیر معمولی باتیں ہوتی ہیں جو اُنہیں تبدیلی کے ان علمبرداروں میں بظاہر دکھائی نہیں دیتی ہیں۔ اس تمام منفی ردعمل اور نامساعد حالات میں کارِ رسالت کا فریضہ ادا کرنے والے نہ صرف صبر سے کام لیتے ہیں بلکہ توکّل علی اللہ کی روش اختیار کرتے ہوئے‘ نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر اپنی مخلصانہ جدّوجہد جاری رکھتے ہیں۔ اس ساری صورتحال و منظرنامے کو سورۃ ابراہیم کی آیات ۹ تا ۱۲ کے مطالعہ سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

(۴) معاشرتی تشکیل نو کے علمبردار جب تمام تر رکاوٹوں اور مخالفت کے‘ اپنا مشن جاری رکھتے ہیں اور اُن کی تحریک اپنی جڑیں پکڑتی رہتی ہے اور ظاہری طور پر اس کے اثرات بھی نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں تو معاشرے پر قابض استحصالی طبقات حقیقی تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت معاشرتی تشکیل نو یا انقلاب کی تمنا ایک طویل تاریخی عمل کا لازمی تقاضا ہوتی ہے‘ لہٰذا نسبتاً دیر سے ہی سہی مگر اس کے لیے کی جانے والی محنت کا بالآخر رنگ لانا ایک فطری امر ہوتا ہے۔ جب معاشرے میں کئی مزید اطراف سے بھی تبدیلی کی آوازیں اٹھنا شروع ہو جاتی ہیں تو نظامِ کہنہ کے رکھوالے‘ تبدیلی کے حقیقی علمبرداروں کے ساتھ گاجر اور چھڑی کی بدنامِ زمانہ پالیسی اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُنہیں اپنے مروّجہ سیاسی و معاشرتی نظام (آج کے دور میں ریاستی آئین) کے تحت اعلیٰ عہدوں کی پیشکش کے ساتھ ساتھ سنگین نتائج کی دھمکیاں

بھی دی جاتی ہیں‘ جن میں ملک بدری اور جان سے مار ڈالنے سمیت تمام آپشن کھلے رکھے جاتے ہیں۔ چونکہ ازروئے قرآن‘ رسولوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی نصرت و محافظت کا انتظام ہوتا ہے‘ لہٰذا تمام حربوں کے باوجود اُن کے مخالفین‘ اُنہیں راستے سے ہٹانے میں ناکام رہتے ہیں۔ (آج کے دور میں یہ خصوصی نصرت و محافظت اور کامیابی کس کے مقدر میں ہوگی‘ اس کا علم اللہ ہی کے پاس ہے‘ وہ جس پر چاہے گا اپنا یہ فضل نازل کرتے ہوئے اسے بالفعل کامیابی کا شرفِ عظیم عطا کرے گا۔ ان حقائق کو مختصراً سورۂ ابراہیم میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٣﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿١٤﴾﴾

”اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تمہیں ملک بدر کر دیں گے یا پھر تمہیں ہماری ملت میں لوٹنا ہوگا (یعنی ہمارے نظامِ حیات کو تسلیم کرنا پڑے گا)‘ تو اس موقع پر اُن کے پروردگار نے اُن کی طرف وحی کی کہ ہم ان ظالموں کو ضرور ہلاک کر ڈالیں گے۔ اور اُن کے بعد ہم تمہیں اس زمین میں بسائیں گے۔ یہ اعزاز اُن کے لیے ہوگا جو میرے سامنے کھڑے ہونے کا ڈر رکھیں گے اور میری وعید (یعنی میرے محاسبے یا میرے عذاب کی وعید) سے خوف کھاتے رہیں گے۔“

آیاتِ درج بالا میں کفار کی طرف سے رسولوں کو جو الٹی میٹم یا آفر دی گئی ہے‘ وہ درحقیقت وہی ہے جو آج کل اہل مغرب اور ان کے حاشیہ نشین مسلم حکمرانوں اور دانشوروں کی طرف سے مروّجہ سیاسی نظام میں شمولیت کے لیے اُن اسلامی جماعتوں کو دی جاتی ہے جو نظام کا حصہ نہیں ہیں‘ بلکہ زبان‘ قلم اور ہتھیار کے ذریعے اس نظام باطل کو للکار رہے ہیں۔ آگے فرمایا:

(۵) ﴿وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿١٥﴾﴾

”اور انہوں نے فیصلہ طلب کر لیا اور تمام جابر و عناد رکھنے والے نامراد ہو کر رہے۔“

جب دھونس‘ دھمکی‘ ایذا رسانی‘ کردار کشی اور ترغیب و تحریص کے تمام حربوں کے باوجود کارِ رسالت ادا کرنے والے اپنے مشن پر مسلسل عمل پیرا رہتے ہیں اور اُن کی انقلابی تحریک کامیابی کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے تو بالآخر وہ مرحلہ آ جاتا ہے جسے آیت درج بالا میں ”استفتاح“ کا نام دیا گیا ہے۔ استفتاح کا مطلب ہے فیصلہ طلب کرنا‘ اور یہ فیصلہ کارِ رسالت کا فریضہ ادا کرنے والے اور اس کا انکار کرنے والے‘ دونوں ہی طلب کیا کرتے ہیں۔ کارِ رسالت

ادا کرنے والے یہ فیصلہ صرف اللہ ربّ العزت سے طلب کرتے ہیں‘ کیونکہ اُن کی جدّوجہد صرف رضائے الٰہی کے لیے ہوتی ہے‘ اُن کا کامل توکّل اللہ پر ہوتا ہے اور اُن کے نزدیک فیصلہ کرنے کا اختیار بھی صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔

دوسری طرف نظامِ باطل کے پیروکار و محافظ‘ یہ فیصلہ اصلاً تو عوام الناس سے طلب کرتے ہیں‘ تاہم اپنی نام نہاد دینداری کا بھرم ظاہر کرنے کے لیے خدا کو بھی اس میں شریک و گواہ بنا لیتے ہیں۔ (ایم کیو ایم کی طرف سے ”طالبان کا پاکستان یا قائداعظم کا پاکستان؟“ نامی نام نہاد عوامی ریفرنڈم کا انعقاد اسی استفتاح کی طرف ایک پیش رفت قرار دیا جا سکتا ہے۔)

درحقیقت یہ لوگ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نوازشات کی بنا پر اس زُعم باطل میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کے تمام اعمال سے راضی ہے‘ لہٰذا قدرت کی طرف سے بھی فیصلہ اُنہی کے حق میں صادر ہوگا۔ آیت مذکورہ بالا میں نظام باطل کے ان نمائندوں کے اصل کردار کی عکاسی کے لیے جبر و عناد کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں‘ جن پر بھی غور کیا جانا چاہیے۔ ان لوگوں کے جبر کا شکار عوام الناس تو ہوتے ہی ہیں تاہم اُن کے بُغض و عناد کا خصوصی نشانہ حق اور اہلِ حق ہوتے ہیں‘ جن کا راستہ روکنے یا اُن کی زبان بندی کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے پر تیار ہو جاتے ہیں‘ تاکہ اُن کے مفادات اور نظام باطل پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ چونکہ ہر چیز کی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہے لہٰذا جب تمام حدیں پھلانگنے اور تمام حربے آزمانے کے باوجود یہ لوگ اہلِ حق کو اُن کے مشن سے ہٹانے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو بالآخر فیصلہ عوام اور اللہ سے طلب کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اپنے پُر پیچ و جابرانہ نظام اور دولت و ثروت کی وجہ سے وہ لوگ پُر اعتماد ہوتے ہیں کہ یہ فیصلہ اُنہی کے حق میں آئے گا‘ در آں حالیکہ قدرت اور تاریخ کا فیصلہ اُن کے خلاف لکھا جا چکا ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا

سورۂ ابراہیم کی ایک اور اہم خصوصیت‘ اس کی آیات ۳۵ تا ۴۱ میں وارد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ خوبصورت دعا ہے جو انہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ کی وادیٔ غیر ذی زرع میں بساتے ہوئے مانگی تھی۔ اس طویل دعا کی دو باتیں (بیت اللہ کی طرف لوگوں کے میلان اور اہلِ مکہ کے لیے فراخی رزق کی دعائیں) تو ایسے قبول ہوئیں کہ اُن کی قبولیت کا اثر نہ صرف آج تک قائم و دائم ہے بلکہ اس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز اضافہ ہی دیکھنے میں آ رہا ہے۔

اس دعا کے بغور مطالعہ سے کسی شہر‘ ملک یا قوم کی آباد کاری کا نہ صرف اصل مقصد معلوم

ہوتا ہے بلکہ کسی معاشرے کی دائمی بقا وخوشحالی کا راز بھی منکشف ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں لوگوں کی آبادکاری بلکہ اس کرۂ ارضی پر نوعِ انسانی کی آبادکاری کا اصل مقصد اس کائنات کے خالق ومالک کی عبدیت کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے‘ جسے قرآن حکیم میں مختلف دیگر ناموں سے مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا میں اقامتِ صلوٰۃ سے موسوم کیا گیا ہے۔ آپؑ کی اس دعا میں دوبارا اقامتِ نماز کا ذکر ہے جس سے نماز کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ درحقیقت ایک ایسی بنیادی اور مسلسل عبادت ہے جس سے نہ صرف خالق کی بندگی کو عملاً تسلیم کرنے کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ اسلام کے پورے نظامِ زندگی کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ قرآن میں اہلِ ایمان کو تمکن واقتدار ملنے پر اُن کی جو ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں‘ ان میں سرفہرست اقامتِ صلوٰۃ ہی ہے‘ جس کی وجہ سے اس میں پورے دین کی اقامت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ قرآن میں اقامتِ صلوۃ کے ساتھ ایتائے زکوۃ کا ذکر بھی جابجا کیا گیا ہے‘ جس کا مقصد معاشرے میں معاشی عدم توازن پیدا ہونے سے روکنا ہوتا ہے۔ سورۂ ابراہیم کی آیت ۳۰ میں جب زوال پذیر معاشرے کا اصل مرض اللہ کی ہمسری اختیار کرنا قرار دیا گیا تو اُس سے اگلی ہی آیت ۳۱ میں نوعِ انسانی کو اقامت صلوٰۃ وانفاق فی سبیل اللہ کا حکم دے کر اس زوال سے بچنے کا آسان نسخہ بھی بتا دیا گیا۔ کرۂ زمین پر نوعِ انسانی کی آبادکاری کے اس اصل مقصد کو فراموش کردینے ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے لبرل وسیکولر سیاستدان اور بے دین دانشور ریاستی وسیاسی امور میں دین اللہ کی شمولیت کو‘ نعوذ باللہ‘ معاشرے میں انتشار وفساد پیدا کرنے کی کوشش قرار دیتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے مکۃ المکرمہ کو امن والا شہر بنانے کی دعا مانگی تھی جو ایسی مستجاب ہوئی کہ یہ شہر ہمیشہ کے لیے دنیا کا سب سے زیادہ عافیت وامن والا شہر قرار پایا۔ اس دعا سے دُنیوی زندگی میں امن وامان کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے‘ مگر آج پاکستانی قوم دین اللہ کے عدم نفاذ و ریاستی پالیسیوں کی وجہ سے اس نعمت سے محروم ہوچکی ہے۔ امن وامان کے اس فقدان کی وجہ سے ہماری معاشی حالت خراب سے خراب تر ہو رہی ہے جس کی وجہ سے مہنگائی‘ بے روزگاری اور خودکشیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں نہ صرف بُتوں کی پرستش سے پناہ مانگی تھی بلکہ نوع انسانی کی اکثریت کی گمراہی کی وجہ بھی بُتوں کی پرستش ہی کو قرار دیا تھا۔ آج دنیا میں (ہندوستان کے سوا) پتھر کے بتوں کی پرستش تو ناپید ہوچکی ہے مگر شیطنت کے پیکر دانشوروں

نے دیگر بے شمار نئے بت تراش کر لوگوں کو اُن کی پُوجا پر لگا دیا ہے۔ وطن پرستی‘ جمہوریت‘ مرد وزن کی مساوات‘ آزادیٔ اظہارِ رائے اور مادّہ پرستی وغیرہ دیگر بے شمار بُت اس قدر حسنِ ترتیب کے ساتھ سجائے گئے ہیں کہ آج ہر شخص انہی کا دیوانہ بنا نظر آتا ہے۔

سرزمین عرب میں نبی کریم ﷺ کی بعثت

ہم جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے باوجود اہل مکہ نے رفتہ رفتہ اقامتِ صلوٰۃ کی اصل غرض وغایت کو بھلا دیا‘ توحید کے مرکز بیت اللہ کو شرک کے گڑھ میں تبدیل کردیا اور آپس کے جنگ وجدال کی وجہ سے حرم مکہ اور حرمت والے مہینوں کی حرمت کو پامال کرنے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آج کے پاکستانی معاشرے کی طرح عرب معاشرہ اس قدر تقسیم و انتشار اور باہمی جنگ وجدال کا شکار ہوچکا تھا کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کے مطابق عرب قوم اُس وقت آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر پہنچ چکی تھی۔

جب سینکڑوں سال بعد‘ سرزمین عرب میں نبی کریم ﷺ کو مبعوث کیا گیا تو اُس وقت حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کا اصل دین اور اس کی تعلیمات ناپید ہوچکی تھیں‘ جو درحقیقت مسلسل تاریخی عمل کا ایک لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ جس طرح ایک شاندار عمارت بھی بالآخر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے‘ اسی طرح کسی معاشرے میں قائم کیا گیا اسلامی نظام بھی نہ صرف بوسیدہ ہو جاتا ہے بلکہ اُس کی اصل شکل وصورت بھی لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ نے دین اللہ کو دوبارہ‘ اُس کی اصل وقدیم حالت میں پیش کیا تو اکثر لوگوں کے لیے یہ بالکل اجنبی تھا اور اسے قبول کرنے والوں کی تعداد بہت محدود تھی۔ معاشرے پر ایسے سرمایہ دار ونام نہاد مذہبی گروہوں کی مضبوط گرفت قائم ہوچکی تھی جو عامۃ الناس کے استحصال کو اپنا جدی پشتی حق سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے معاشرتی‘ مذہبی اور سیاسی نظام کا تانا بانا اس طرح سے بُن رکھا تھا کہ ہر شخص اس میں بری طرح سے جکڑ دیا گیا تھا۔ اگرچہ اس نظامِ باطل کی نفی کرنے اور اسے للکارنے والی شخصیت (رسول اللہ ﷺ) معاشرے کے اسی طبقے سے تعلق رکھتی تھی‘ پھر بھی آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نہ صرف اپنے ہی اس طبقے اور بھائیوں کی طرف سے بے شمار مصائب ورکاوٹیں پیش آئیں بلکہ عام لوگوں کی بے رخی وبے پرواہی سے بھی پالا پڑا۔ چونکہ قدرت الٰہی کی طرف سے عرب معاشرے کی حتمی تشکیل نو کا فیصلہ ہوچکا تھا لہٰذا تبدیلی کے راستے میں عملاً رکاوٹ بننے والوں کو بالآخر قدرت کے انتقام کا سامنا کرنا پڑا۔

انتقامِ قدرت کا قانون

انتقامِ قدرت کے اس نظام کا اگر ہم تاریخ کی روشنی میں جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل صرف سچے اہلِ ایمان کو بچا کر پوری کی پوری قوم تباہ و برباد کر دی جاتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کے مخاطب بنی اسرائیل اور آلِ فرعون دونوں تھے مگر نہ تو پوری قومِ فرعون کو غرق کیا گیا اور نہ ہی بنی اسرائیل کے تمام منکرین حق کو' بلکہ صرف اُن لوگوں کو ہلاک کیا گیا جو حق کی مخالفت میں عملاً سرگرم تھے' جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ فرعون کے ساتھ اُس کا صرف وہ لشکر غرق ہوا تھا جو بنی اسرائیل کا تعاقب کر رہا تھا۔ اسی طرح قارون اور اس کے کارندوں کے سوا پوری قوم بنی اسرائیل نہ صرف محفوظ رہی بلکہ بہت سی نوازشات کی مستحق بھی ٹھہری' حالانکہ اس میں سامری سمیت ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔

یہی وہ وقت تھا جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلی بار باضابطہ طور پر کفار کے خلاف قتال کا حکم دیا گیا' جس کا مطلب یہ تھا کہ ازل سے جاری حق و باطل کے معرکوں میں اب اہل باطل کی سرکوبی کے لیے اہل حق کی جنگی صلاحیت کو بھی کام میں لایا جائے گا۔ قتال کے اس حکم کا اصل منشا' حق کے دعویداروں کے ایمان کی جانچ و پرکھ ہے' ورنہ اسبابِ ظاہری کے لحاظ سے اہلِ حق' اہلِ کفر کے مقابلہ میں کبھی بھی ہم پلہ نہیں رہے' بلکہ اُن کی تمام تر فتوحات نصرتِ الٰہی کی مرہونِ منت رہی ہیں۔ بنی اسرائیل نے پہلے پہل تو اس حکم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر حالات کے جبر کی وجہ سے بالآخر اس کی تعمیل کرنا پڑی' یہاں تک اُن کے جہاد و قتال کی برکات سے حضرت طالوت' حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا سنہری دور اُن کے حصہ میں آیا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جب بنی اسرائیل نے جہاد و قتال سے دوبارہ راہ فرار اختیار کی تو اُنہیں مختلف اقوام کی غلامی کے عذاب میں بھی مبتلا ہونا پڑا۔

ہجرتِ مدینہ اور انقلابِ اسلامی کا صحیح طریقہ

نبی کریم ﷺ نے سرزمین عرب میں جو انقلاب برپا کیا' وہ بھی اگرچہ جہاد و قتال کی بدولت ہی کامیابی کی منازل طے کر سکا' تاہم ہجرتِ مدینہ سے پہلے آپ ﷺ کی تمام تر جدوجہد ارضِ مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جدوجہد کے مماثل ہے' جہاں قتال اور ہتھیار اٹھانے کی کوئی نظیر نہیں ملتی' جبکہ ہجرت کے بعد جنگوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ نظر آتا ہے۔

ہجرتِ مدینہ سے ہمیں تین بڑے سبق ملتے ہیں: اوّل یہ کہ قتال کا سلسلہ شروع کرنے

سے پہلے ایک مناسب مرکز اور مرکزیت کا قیام ضروری ہے۔ دوم یہ کہ قتال اُس وقت اور اُسی علاقے میں کیا جائے گا جہاں حالات اس کے لیے موافق و سازگار ہوں گے' اور سوم یہ کہ ایک محدود اسلامی مرکز کا قیام تو محض دعوت و تبلیغ سے بھی ممکن ہے' مگر ایک مضبوط و مؤثر اسلامی ریاست کے قیام' بقا اور توسیع کے لیے نظامِ باطل کے ساتھ تصادم و ٹکراؤ ناگزیر ہے۔

دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی کی وجہ سے ریاستی افواج اس قدر طاقتور ہو چکی ہیں کہ کسی ریاست کے خلاف مسلح جہاد تقریباً ناممکن بن چکا ہے۔ اگرچہ شام' عراق اور افغانستان وغیرہ میں ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد جاری ہے' تاہم وہاں لوگوں کا خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے' جبکہ حقیقی اسلامی انقلاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی خاطر لوگوں کا خون کم سے کم بہایا جاتا ہے۔ جب کسی معاشرے میں خون کی ندیاں بہانے کے بعد انقلاب آتا ہے تو اُس کے قرار و ثبات اور توسیع کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔ مزید برآں جب کوئی ملک خانہ جنگی کا شکار ہوتا ہے تو وہاں بیرونی سامراجی طاقتوں کو مداخلت کا موقع بھی مل جاتا ہے جو وہاں اپنی مرضی کا منظرنامہ تشکیل دے کر انقلاب یا پھر اس کے مقاصد ہی کو ہائی جیک کر لیتی ہیں اور نتیجۃً بالعموم آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا ہی برآمد ہوا کرتا ہے۔

ہجرتِ مدینہ کے تناظر میں یہ بات بھی ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ محض دعوت و تبلیغ کے ذریعے کسی خطے میں جزوی انقلاب یا ایک محدود اسلامی مرکز کا قیام تو ممکن ہو سکتا ہے مگر ایک ایسے حقیقی اسلامی انقلاب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جس کے اثرات عالمگیر سطح پر مرتب ہوں اور جو نام نہاد انٹرنیشنل لاء کی صورت میں دنیا پر مسلط' موجودہ عالمی طاغوتی نظام کے خاتمہ کی طرف پیش رفت کر سکے۔ یہی حقیقت اسلامی انقلاب کی داعی اُن سیاسی جماعتوں کو بھی سمجھ لینی چاہیے کہ مروّجہ جمہوری عمل کے ذریعے خدا خدا کر کے کامیابی حاصل کر لینے والی اسلامی جماعت کو عالمی سامراج کے کارندے اُس وقت تک اقتدار منتقل نہیں ہونے دیتے جب تک کہ وہ عالمی سطح پر مروّج انٹرنیشنل لاء کو تسلیم کرنے کی یقین دہانی نہیں کروا دیتے' جیسا کہ فلسطین' تیونس اور مصر وغیرہ میں ہو چکا ہے۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابات کے نتیجہ میں صوبہ خیبر پختون خوا میں بھی ایم ایم اے کو اسی شرط پر اقتدار منتقل کیا گیا تھا کہ وہ مرکزی حکومت کے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں بنے گی اور ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنا یہ وعدہ آخری دم تک نبھا کر حق وفاداری ادا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

اگر ہم قرآن حکیم اور سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں نوعِ انسانی کی طرف مبعوث ہونے والے رسولوں کے واقعات کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اُن میں سے کسی ایک نے بھی اپنے دور کے مروّجہ سیاسی نظام میں کوئی عہدہ قبول نہ کیا دراں حالیکہ اُنہیں اس کی متعدد بار پیشکش کی جاتی رہی۔ چونکہ رسولوں کی جدوجہد بنیادی طور پر اپنے دور کے مروّجہ بدترین نظام کے خاتمہ کے لیے ہی ہوتی تھی‘ لہٰذا کوئی بھی عہدہ قبول کرنے کا مطلب مروّجہ نظام کو تسلیم کرنا‘ اسے تقویت عطا کرنا اور اپنی جدّوجہد سے پیچھے ہٹنے کے مترادف قرار پاتا۔

جبارین کا طرزِ عمل اور اُن کا انجامِ بد

قرآن حکیم کی بے شمار آیات اور رسولوں کے واقعات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب کسی قوم میں کارِ رسالت سرانجام دیا جا رہا ہوتا ہے تو اُس قوم کے جباروں پر حتمی عذاب کے نزول سے قبل بطورِ تنبیہہ متعدد چھوٹے عذاب نازل کیے جاتے ہیں‘ تاکہ اُسے اصلاحِ احوال کا موقع فراہم کیا جا سکے۔ چونکہ ایسے عذاب ہائے الٰہی کا نشانہ بالعموم عامۃ الناس ہی بنتے ہیں اور جبارین کا طبقہ زیادہ تر محفوظ رہتا ہے‘ لہٰذا یہ طبقہ ان سے کوئی سبق حاصل کرنے کی بجائے دن بدن نہ صرف تکبر وغرور میں بڑھتا چلا جاتا ہے بلکہ حق کے خلاف اُس کی مخاصمت اور اہل حق کے خلاف ظلم وجور میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

اگر ہم موجودہ عالمی منظر نامے کا جائزہ لیں تو اس میں امریکی ریاست کا کردار دنیا کی سب سے جابر ومتکبّر قوت کے طور پر سامنے آتا ہے‘ جبکہ پاکستانی ریاست کو اُس کی سب سے بڑی گماشتہ کہا جا سکتا ہے۔ دونوں ریاستوں کے رہنماؤں کا مائنڈ سیٹ تقریباً ایک جیسا ہے‘ کیونکہ ان دونوں کو اسلام کے سیاسی‘ معاشی اور معاشرتی نظام سے بے انتہا نفرت ہے اور وہ اسے اپنے اقتدار وغلبہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ بھی سمجھتے ہیں۔ بہت سے اختلافات کے باوجود حال اور مستقبل کے بارے میں اُن کا ایجنڈے میں بہت یکسانیت ہے۔

اگرچہ دونوں ممالک کی معاشی حالت روز بروز بگڑتی چلی جا رہی ہے اور قرضوں کے بوجھ میں بھی بے انتہا اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے‘ مگر یہ دونوں ہی ممالک ایک طویل عرصہ سے اپنی اپنی عسکری قوت اور اپنی اپنی بساط واہلیت کے مطابق اپنے اپنے زیردستوں کی جبری وجذباتی بلیک میلنگ میں مصروف ہیں (اس حقیقت کو آصف زرداری اور الطاف حسین کی باہمی مفاہمت ومخاصمت کے تناظر میں سمجھا جائے تو زیادہ آسانی رہے گی)۔ دونوں ریاستیں دنیا کے

ہر ذی ہوش اور امن پسند انسان کے لیے مستقل دردِ سر بن چکی ہیں‘ کیونکہ جب بھی دنیا میں امن اور اختلافات کے خاتمے کی کوئی کوشش ہوتی ہے تو یہ اپنی سازشی پالیسیوں کے ذریعے اسے ناکام بنا دیتی ہیں تاکہ اُن کی چودھراہٹ میں کچھ کمی واقع نہ ہو سکے۔

کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں‘ لہٰذا دونوں ریاستوں کی اس دہشت گردی کا خاتمہ اب زیادہ دور نہیں‘ کیونکہ از روئے قرآن ان دونوں کا گھیرا دن بدن تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اپنے نام نہاد وفرضی دشمنوں کے خلاف جنگوں کے لامتناہی سلسلوں‘ جہادی عناصر کی زبردست مزاحمت‘ قرضوں کے انبار‘ اپنے اپنے نام نہاد اتحادیوں کی ڈبل گیم‘ دن بدن بے نقاب ہوتی ہوئی اُن کی اصلیت اور اس کے نتیجہ میں جنم لیتے ہوئے عوامی غیظ وغضب کے طوفان اور بالآخر قدرتِ الٰہی کی طرف سے دی گئی مہلت کے خاتمہ کے نتیجہ میں اُن کا انجام عنقریب سامنے نظر آ جائے گا۔ نائن الیون کے بعد دونوں ریاستوں کی طرف سے بڑے پیمانے پر کی جانے والی ریاستی دہشت گردی کی وجہ سے دونوں ہی ممالک مختلف اقسام کے عذاب ہائے الٰہی کی لپیٹ میں آ چکے ہیں‘ جن میں قدرتی آفات اور معاشی بحرانوں کا بطور خاص نام لیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم میں سب سے زیادہ مرتبہ بیان کیے گئے قصہ فرعون وموسیٰؑ کی روشنی میں ہم قوی امید رکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے قارون کی طرح پاکستان کے قارون صفت اور فرعونِ مصر کی طرح‘ امریکا کے فرعون صفت طبقات جلد ہی عبرت ناک انجام کو پہنچیں گے۔ قارون کے واقعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون سے بھی پہلے اُسے لوگوں کے لیے مقامِ عبرت بنانے کا مقصد بنی اسرائیل کو فرعون کے خلاف خروج پر آمادہ کرنا تھا اور غالباً اب بھی ایسا ہی ہونے جا رہا ہے۔ پاکستان کے قارونِ اوّل (پرویز مشرف) کے انجام سے اُس کے جانشین کچھ محتاط تو ضرور ہوئے ہیں مگر اپنی بداعمالیوں سے تائب ہرگز نہیں ہوئے۔ اب کی بار وہ اپنی بقا وحفاظت کے لیے جو تدبیریں اختیار کریں گے‘ ان شاء اللہ وہی اُلٹی ہو کر جلد ہی اُن کے گلے میں پڑی نظر آئیں گی۔

دین اللہ کے قیام وغلبہ کی اہم ترین رکاوٹوں کے خاتمہ کے بعد دین اللہ کی داعی و پرچارک قوتوں کو کارِ رسالت کے بنیادی مقصد یعنی دین اللہ کے عملی قیام وغلبہ کے لیے اپنوں اور غیروں کی طرف سے دیگر بے شمار رکاوٹوں اور مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑے گا‘ جس کے لیے ذہنی تیاری ابھی سے کر لینی چاہیے۔

بیت اللہ میں واقع مقامِ ابراہیمؑ اور پاکستان

سورۂ ابراہیم کے مضامین اور پاکستان کے موجودہ حالات میں مماثلت کا بیان تو کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا جا ہی چکا ہے' تاہم ارضِ پاکستان کو بیت اللہ الحرام میں واقع مقامِ ابراہیم کے ساتھ بھی ایک خصوصی نسبت حاصل ہے۔ بیت اللہ الشریف کے دروازے والی دیوار جو حجرِ اسود سے شروع ہو کر رکن عراقی تک جاتی ہے' ملتزم کہلاتی ہے اور احادیث میں اس کی بہت زیادہ فضیلت بھی بیان کی گئی ہے۔ اسی دیوارِ ملتزم کے سامنے مقامِ ابراہیمؑ بھی ہے جس کا تذکرہ قرآن حکیم میں بھی بطورِ خاص کیا گیا ہے اور جس کی اہمیت وفضیلت بھی مسلّمہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بابِ کعبۃ اللہ' دیوارِ ملتزم اور مقامِ ابراہیم' تینوں ہی بیک وقت ارضِ پاکستان کے بالکل سامنے واقع ہوئے ہیں اور اس نسبتِ خصوصی کو یقیناً اہلِ پاکستان کی خوش بختی کی علامت ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

مزید برآں مدینۃ النبی ﷺ اور ارضِ پاکستان کے مابین جو نسبتیں ہے' اُن کا بھی ہر صاحبِ علم کو خوب ادراک ہے۔ جاہلیتِ قدیمہ کے خاتمہ سے قبل اسلام کے نام پر نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے قائم ہونے والی پہلی ریاست مدینہ منورہ تھی تو موجودہ جاہلیتِ جدیدہ کے دور میں اسلام کے نام پر نظامِ اسلامی کے قیام کی خاطر جو ریاست قائم کی گئی ہے' وہ دنیا میں صرف اور صرف پاکستان ہے۔ ہجرتِ مدینہ کی تاریخِ اسلام میں بے حد اہمیت ہے تو ۱۹۴۷ء میں ارضِ پاکستان کی طرف لاکھوں لوگوں کی ہجرت کو بھی دورِ حاضر کی تاریخ میں بہت اہمیت حاصل ہے اور ان دونوں ہجرتوں کا بنیادی سبب بھی دینِ اسلام سے تعلق ہی بنا تھا۔ جس طرح اہلِ مکہ اور اہلِ مدینہ کی مشترکہ جدّوجہد کے نتیجہ میں سرزمینِ عرب میں ایک حقیقی وکامیاب انقلاب برپا ہوسکا تھا' اُسی طرح ہم قوی امید رکھتے ہیں کہ اہلِ پاکستان واہلِ افغانستان کی مشترکہ جدوجہد کے نتیجہ میں ایک ایسا اسلامی انقلاب ضرور برپا ہوگا جس کا سچے اہلِ ایمان شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے اہلِ افغانستان کی جدوجہد اور قربانیاں تو ہمارے لیے مینارۂ نور ہیں' مگر ہم پاکستانی بحیثیت قوم اس وقت وہی کردار ادا کر رہے ہیں جو مشرکینِ مکہ اہلِ ایمان کے خلاف ادا کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس بھیانک کردار سے تائب ہونے اور بطور مسلمان وبطور پاکستانی' ہمارے اوپر عائد ہونے والی عمومی وخصوصی ذمہ داریوں کا شعور اور ان کی کما حقہ بجا آوری کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

❁❁❁

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی شخصیت

(۱۸۸۸ء — ۱۹۵۸ء)

عبدالرشید عراقی

مولانا ابوالکلام آزاد ایک نادرِ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ اُن جیسی جلیل القدر شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں جو افکار و تصورات کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کی ذات میں ایسے گوناگوں اوصاف اور محاسن جمع ہو گئے تھے جو کسی ایک وجود میں بہت کم ہی جمع ہوتے ہیں۔ انہوں نے زندگی میں جو انتہائی بلند مقام حاصل کیا اس کا حصر مشکل ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد میں فطری عظمت تھی۔ وہ اپنے گوناگوں اوصاف و کمالات کے اعتبار سے ایک جیّد عالمِ دین، مفسّرِ قرآن، محدّث، مورّخ، محقّق، مجتہد، فقیہہ، نقّاد، ادیب، متکلّم، مبصّر، دانشور، خطیب و مقرّر، شاعر، فلسفی اور بڑے بلند مرتبہ کے سیاست دان تھے۔ اُن کے علم و فضل اور علومِ اسلامیہ میں جامع الکمالات ہونے کا برصغیر کے نامور علماء، ادباء اور سیاسی راہنماؤں نے اعتراف کیا ہے۔ مولانا ظفر علی خانؒ فرماتے ہیں:؎

جہانِ اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہو گئی
ہے تجھ کو اس میں جستجو تو ابوالکلام ہے!

شورش کاشمیری مرحوم و مغفور لکھتے ہیں کہ میں نے اس شعر کے بارے میں مولانا ظفر علی خان سے دریافت کیا کہ ''یہ شعر حقیقت ہے یا مبالغہ آرائی؟'' مولانا ظفر علی خان نے فرمایا: ''حقیقت ہے، مبالغہ آرائی نہیں''۔ مولانا محمد یونس خالدی اپنے ایک مضمون میں مولانا آزاد کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہم مولانا ابوالکلام آزاد کو جس دور میں دیکھتے ہیں اس دور میں اکابر علماء نظر آتے ہیں۔ لیکن جب ہم کسی جامع شخصیت کو تلاش کرنا چاہتے ہیں اور اس کو معیار قرار دینا چاہتے ہیں تو ڈھیرے ڈھیرے وہ سب شخصیتیں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ صرف ایک شخصیت

مولانا کی آتی ہے جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے باقی رہنے والی شخصیت ہے۔''(۱)

مولانا ابوالکلام آزاد نثر میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنے ایک شعر میں فرمایا ہے:؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا!

خطابت میں بھی آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ان کی خطابت کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے ان کی تقاریر سنی ہیں۔ مولانا نصر اللہ خاں عزیز مولانا کی خطابت کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''ابوالکلام کی خطابت کا اندازہ صرف وہ خوش قسمت لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے اس جادو بیان مقرر کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ابوالکلام آزاد کے پائے کا مقرر صدیوں سے پیدا نہیں ہوا۔ ذرا ابوالکلام کے خطبہ کو پڑھو۔ اس میں بجلی کی کڑک، رعد کی گرج، دریا کی روانی، سبزہ زاروں کی طراوت، پہاڑوں کا شکوہ، گلستانوں کا جمال، ناشید کا نغمہ، کچھ اس طرح حسین تناسب کے ساتھ گھلا ملا ہوا ملے گا کہ انسان محسوس کرے گا میں وادی کشمیر کی سیر کر رہا ہوں۔''(۲)

پروفیسر رشید احمد صدیقی مولانا آزاد کی شخصیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''مولانا ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جو اپنے عہد سے بڑی تھیں، وہ آفریدۂ عہد تھے۔ اس لیے ان کی کشاکش ایسے لوگوں سے رہتی جو زائیدۂ عہد ہوتے۔ وہ ہماری تاریخ، ہماری تہذیب اور ہمارے علوم کا اعتبار و افتخار تھے۔'' (۳)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ادب کے ہر میدان میں اپنا لوہا منوایا۔ تقریر و تحریر میں ان کا کوئی ہم پلّہ نہ تھا۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم: سرسید، شبلی، حالی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد سب کے انداز میں لکھنے والے ہمارے یہاں مل جائیں گے، لیکن مولانا کا پیرو ایک نہ ملے گا۔ خطابت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ اردو میں خطابت کا ریکارڈ قائم کیا۔ تحریر و انشا میں اپنے اسلوب کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ سیاسیات کے کوچہ میں قدم رکھا تو دیکھتے ہی دیکھتے صف اول کے لیڈروں میں شمار ہونے لگے۔ جناب مشفق خواجہ مولانا کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ابوالکلام آزاد ایک فرد کا نام ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی گزشتہ نصف صدی کی تہذیبی و ثقافتی، علمی و ادبی اور مذہبی و سیاسی تاریخ بھی ہے۔ اس انسانی پیکر میں علم و فضل کی

ایک دنیا آباد تھی۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت علم وکمال کی ان تمام بلندیوں سے آشنا تھی جو کسی بھی انسان کے لیے سرمایۂ افتخار ہوسکتی ہیں۔ ان کی تقریر وتحریر کے جادو نے نہ صرف یہ کہ علم وادب کی دنیا کو ہم پایہ آسمان کر دیا' بلکہ برصغیر ہندوپاکستان کے عوام کو سامراجی حکومت کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت بھی دلائی۔ وہ ایک قدر اول کے انشاپرداز' بلند خیال مفکّر کی حیثیت سے اپنی مثال آپ ہیں اور ایک ایسے مقام پر نظر آتے ہیں جہاں وہ تنہا ہیں اور ان کا کوئی حریف نہیں۔''(۴)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری حفظہ اللہ مولانا آزاد کی شخصیت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد صاحبِ علم وبصیرت تھے۔ ان کا ذہن رسا' نظر تیز' مطالعہ وسیع اور حافظہ بلا کا تھا۔ ان کے اندر حالات وواقعات کے تجزیہ اور تفرید کی اعلیٰ صلاحیت تھی۔ معاملات ومسائل سے نتائج کے استخراج میں وہ عدیم المثال قابلیت کے مالک تھے۔ اپنے علم ومطالعہ کو پیش آنے والے حالات ومسائل پر تطبیق دینے کی صلاحیت ان میں اعلیٰ درجے کی موجود تھی۔''(۵)

سوانح

مولانا ابوالکلام آزاد کے بزرگ ہرات کے رہنے والے تھے' جہاں سے وہ مغل فرمانروا ظہیر الدین بابر کے عہد حکومت (۱۵۲۶ء۔۱۵۳۰ء) میں ہندوستان آئے۔ شروع میں دارالخلافہ آگرہ میں قیام کیا۔ بعد میں اکبر کے عہد حکومت میں دلی منتقل ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا پانچویں جد تک شجرہ نسب یوں ہے: مولانا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد بن شیخ خیرالدین بن شیخ محمد ہادی بن شیخ محمد افضل بن شیخ محمد حسن۔

مولانا ابوالکلام آزاد ۲۲/اگست ۱۸۸۸ء مطابق ۱۴/ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ محلّہ قدوہ متصل باب السلام مکہ معظّمہ میں پیدا ہوئے۔ مولانا کا تاریخی نام فیروز بخت تھا اور مصرع ذیل سے سن ہجری کا استخراج کیا گیا تھا:

جواں بخت' جواں طالع' جواں باد

۱۳۰۵ھ

مولانا کے والد محترم کا نام مولانا خیر الدین تھا جو ایک غالی مقلد تھے اور ان کا پیری مریدی کا سلسلہ تھا۔ ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵/اگست ۱۹۰۸ء کو کلکتہ میں وفات پائی۔ مولانا آزاد کی والدہ محترمہ کا نام عالیہ تھا جو شیخ محمد ظاہروی کی صاحبزادی تھیں اور

بڑی عاقلہ و فاضلہ خاتون تھیں۔ دینیات اور فنونِ عربیہ میں متوسط درجے تک تعلیم تھی۔ علمِ فرائض میں انہیں خاصی مہارت تھی۔ دینی مسائل سے واقفیت کے ایک واقعے کا مولانا نے ذکر کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ ایک عورت جو ملتان سے آئی تھی' فرائض یعنی تقسیم ورثہ کا ایک نہایت پیچیدہ سوال کیا۔ انہوں نے ایک منٹ کے اندر غور کر کے اس کا جواب دے دیا۔ وہ جواب مجھے یاد ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ آج مجھ سے کوئی اس نوعیت کا سوال کرے تو میں بغیر کاغذ پر حساب کرنے اس کا جواب نہیں دے سکتا۔''(۶)

مولانا خیر الدین کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں: ابوالنصر غلام یٰسین آہ اور ابوالکلام محی الدین احمد آزاد۔ بیٹیوں کے نام یہ ہیں: زینب' فاطمہ (آرزو بیگم)' حنیفہ (آبرو بیگم)۔ مولانا اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ مولانا کے بڑے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین آہ نے ۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں انتقال کیا۔ مولانا کی بہن حنیفہ (آبرو بیگم) کا جون ۱۹۴۲ء میں بھوپال میں انتقال ہوا اور دوسری بہن فاطمہ (آرزو بیگم) ۳/اپریل ۱۹۶۶ء کو ۸۲ سال کی عمر میں بھوپال میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تعلیم کا آغاز پانچ سال کی عمر میں بیت اللہ شریف میں ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں مولانا اپنے والد کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے۔ مولانا کی تعلیم کے سلسلہ میں ان کے والد مولانا خیرالدین نے بہترین اساتذہ کا انتخاب کیا۔ مولانا نے جن اساتذہ سے مختلف علوم اسلامیہ میں استفادہ کیا ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

خود مولانا خیر الدین' شیخ محمد عمر مکی' شیخ حسن مکی' مولانا محمد یعقوب دہلوی' مولانا محمد ابراہیم' شمس العلماء مولانا سعادت حسین' مولانا محمد شاہ محدث رام پوری' مولانا نظیر الحسن امیٹھوی اور شیخ الکل مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی۔

۱۹۰۳ء میں جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی عمر ۱۵ سال تھی' علومِ اسلامیہ کی تکمیل سے فراغت پائی۔

عملی زندگی

مولانا آزاد نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا اور ماہنامہ ''خدنگ نظر'' لکھنؤ سے مدیر معاون کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد جن اخبارات اور رسائل وجرائد سے آپ کا تعلق مدیر یا نائب مدیر یا رکن مجلس ادارت کی حیثیت سے رہا ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

ماہنامہ نیرنگِ عالم کلکتہ' ہفت روزہ المصباح کلکتہ' رسالہ محمدیہ کان پور' ہفت روزہ احسن

الاخبار کلکتہ' ایڈورڈ گزٹ شاہجہان پور' ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ' ماہنامہ الندوہ لکھنؤ' سہ روزہ وکیل امرتسر' ہفت روزہ دارالسلطنت کلکتہ' ہفتہ وار الہلال کلکتہ' ہفت روزہ البلاغ کلکتہ' ہفت روزہ پیغام' ہفت روزہ پیام کلکتہ' پندرہ روزہ الجامعہ (عربی) کلکتہ۔

ہفت روزہ الہلال کا اجراء

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۳/ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے ہفت روزہ ''الہلال'' جاری کیا۔

الہلال مختلف حیثیتوں سے اردو صحافت میں ایک نیا باب تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ہماری ادبی' صحافتی' معاشرتی اور سیاسی تاریخ میں سنگِ میل ثابت ہوا۔ الہلال عصری صحافت میں محض ایک اور اخبار کا اضافہ نہ تھا بلکہ وہ اپنی ذات میں ایک مستقل تحریک تھا جس نے طوفانِ حوادث میں اسلامیانِ عالم اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی ناخدائی کا فریضہ سرانجام دیا۔

الہلال محض ایک اخبار نہیں دراصل ایک صورِ قیامت تھا' جس کی ''صدائے رعد آسائے غفلت شکن'' نے مردہ دلوں میں ایک نئی جان ڈال دی۔ سرگشتگانِ خوابِ ذلت وخواری کو بیدار کیا' وہ شعلۂ قیامت جو سرد ہو رہا تھا اس کو بھڑکا دیا۔ ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ کلمۂ حق بلند کیا اور جرأت' حق گوئی اور راست بازی کی وہ روشن مثال قائم کی جو ہماری صحافت کی تاریخ میں بالکل نئی ہے۔

الہلال نے اپنے دور میں برصغیر میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا۔ بیگم ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

''یہ اخبار مسلمانانِ ہند کی انقلابی سیاست کا آئینہ دار تھا۔ مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے ملکی اور بین الاقوامی امور کی آزاد ترجمانی کا شرف اس کو حاصل تھا۔ چنانچہ ترکی کے جدید انقلابات' طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں کے واقعات اور پھر جنگ عظیم میں ترکی کی حکمت عملی کے متعلق الہلال میں طویل بحثیں موجود ہیں۔

اسی طرح ملکی سیاست میں مسلم لیگ اور کانگریس کے جھگڑے' حقوق و مراعات کے قصے اور انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی تشریحیں بھی الہلال کے اوراق میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تعلیمی معاملات میں ندوہ اور علی گڑھ کی سرگرمیاں اور ان میں سرکار پرستوں کی دسیسہ کاریاں بھی الہلال نے اچھی طرح کھول کر واضح کی ہیں۔'' (۷)

مولانا آزاد ایک خاص ذہن اور دماغ کے ساتھ آسمانِ صحافت پر طلوع ہوئے جب ہماری فضائے ادب روشن تھی اور اردو کے عناصرِ خمسہ میں سے حالی' شبلی اور نذیر احمد زندہ تھے۔

ان کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں کا زمیندار' مولانا محمد علی جوہر کا ہمدرد' اور مولانا وحید الدین سلیم کا معلّم گزٹ آسمانِ صحافت پر جلوہ افروز تھے۔ مولانا ابوالکلام نے دہلیز پر قدم رکھتے ہی ایسی زبردست چوٹ لگائی کہ سب کے کان ان کی طرف لگ گئے اور سب کی نگاہیں ان کی طرف اُٹھ گئیں۔

الہلال کے دورِ اوّل میں اس کے ادارۂ تحریر میں مولانا آزاد کی دلکش شخصیت اور ان کے ساتھ برصغیر کی نامور علمی و ادبی شخصیات کا جمع ہو جانا ایک نعمت عظمیٰ تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی' مولانا عبدالسلام ندوی' خواجہ عبدالواجد ندوی' علامہ عبداللہ عمادی' مولانا حامد علی صدیقی الہلال کے ادارہ تحریر میں شامل تھے۔ مالک رام لکھتے ہیں:

''الہلال کے تمام کارناموں سے قطع نظر اس کی اہمیت اور معیار کا اندازہ لگانے کے لیے صرف اس کا حیرت انگیز ادارۂ تحریر ہی کافی ہے جو ملک کے صفِ اول کے ادیبوں' انشا پردازوں پر مشتمل تھا۔ ہفتہ وار تو درکنار کسی اردو ماہنامے کو بھی آج تک ایسا شاندار ایڈیٹوریل سٹاف نہ ملا ہوگا۔'' (۸)

جس شخص کے مطالعہ میں الہلال اور البلاغ آیا ہے وہ اس سے بخوبی واقف ہوگا کہ الہلال کی تحریر پڑھنے والے کو مسحور کر دیتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر فرماتے ہیں:

''میں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی۔''

سجاد انصاری اپنی کتاب ''محشرِ خیال'' میں مولانا ابوالکلام کی نثر نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم —— میرے نزدیک اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد حقیقی معنوں میں فوق البشر ہیں۔'' (۹)

مالک رام صاحب الہلال کی تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''الہلال کئی لحاظ سے عہد آفریں ثابت ہوا۔ اس شان کا کوئی پرچہ اردو میں شائع نہیں ہوا تھا' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد جو بھی پرچے نکلے ان کے سامنے نمونہ ''الہلال'' ہی کا رہا۔ ہر ایک کی یہی خواہش رہی کہ شکل وصورت' مضامین کی ترتیب' اداریے' تصاویر وغیرہ میں ''الہلال'' کا تتبع کریں۔

لیکن ظاہری حسن اور طباعتی خوبیوں سے قطع نظر الہلال کا اصلی کارنامہ اس کے مدیر شہیر کی طرزِ تحریر کی بداہت تھی۔ کاہے کو کبھی کسی رسالے کے ایڈیٹر نے اپنے ہم وطنوں کو' اربابِ حکومت کو' اکابر قوم کو' علمائے دین کو یوں للکارا ہوگا۔ مولانا آزاد نے کسی کو نہیں

بخشا اور کوئی ان کی نگاہِ احتساب کی زد سے باہر نہیں رہا۔ جہاں بھی کوئی غلط بات ان کے سامنے آئی' انہوں نے اس پر بے خوفی اور عواقب سے بے پرواہ ہو کر گرفت کی اور سب سے بڑی بات یہ کہ خوش نصیبی سے ان کی بے لاگ تنقید کا اثر ہوا اور اس سے حسب دلخواہ نتائج پیدا ہوئے۔'' (۱۰)

مولانا ابوالکلام آزاد اُن برگزیدہ نفوس میں سے ہیں جن کو ندرتِ ذوق وفکر اور قدرتی بخشائش کی فراوانی نے صف اول سے الگ اور مستثنیٰ قرار دے دیا ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس ذہانت وذکاوت کا سحر قلم اور آتش بیان صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ جناب مالک رام لکھتے ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ مولانا آزاد ایک مذہبی اور صوفی خانوادے کے چشم وچراغ تھے' ان کی تعلیم وتربیت بھی اسی نہج پر ہوئی تھی' لامحالہ عمر بھر مذہب ہی ان کے غور وفکر کا محور رہا' انہوں نے جو تحریری ورثہ اپنے پیچھے چھوڑا وہ بھی بیشتر مذہب اور مذہبی موضوعات ہی سے متعلق ہے' لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عملی زندگی اور معنوی افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ بنیادی طور پر صحافی اور انشاپرداز تھے۔'' (۱۱)

اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں اور یہ مبنی بر حقیقت ہے کہ ہماری صحافت کی تاریخ میں کسی اخبار کی اس حیرت انگیز مقبولیت کی مثال خال خال ہی مل سکتی ہے جو الہلال اور البلاغ کو مختصر مدت میں حاصل ہوئی۔

الہلال کی دعوت

الہلال کا پہلا شمارہ ۱۳/ جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا تھا۔ الہلال ایک دعوت تھا جس کا مقصد دین اسلام کی تجدید اور اس کے بنیادی اصول ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کو زندہ کرنا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا ابوالکلام جہاں کہیں بھی قابل اعتراض بات دیکھتے' بے باکانہ اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کرتے اور حکومت وقت پر سخت لب ولہجہ میں نکتہ چینی کرتے۔ الہلال کی دعوت تقلید پرستی سے بغاوت تھی۔ مولانا لکھتے ہیں:

''تقلید کے اہرمن سے بڑھ کر انسان کی تمام یزدانی خصائل کا اور کوئی دشمن نہیں۔ انسانی اعمال کی جس قدر گمراہیاں ہیں ان سب کی تخم ریزی صرف تقلید ہی کی سرزمین میں ہوتی ہے۔ تقلید پرستی کی عادت ہلاکت وبربادی کی ایک چٹان ہے جو انسانی تدبّر وتفکّر اور ادراک وتعقّل کی تمام قوتوں کو کچل ڈالتی ہے اور اس کی قوتِ نشوونما کا دائمی سدباب کر دیتی ہے۔ اسی لیے قرآن نے مقلدین محض کو چارپایوں اور حیوانوں سے تشبیہہ دی

ہے اور پھر اس کو بھی اظہارِ ضلالت کے لیے ناکافی قرار دے کر ان سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ ان کے پاس دل ودماغ ہیں مگر نہیں دیکھتے' کان ہیں مگر نہیں سنتے اور خود اپنے ذہن سے کام نہ لینے اور مقلد محض ہونے میں وہ مثل چارپایوں کے ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ تر۔'' (۱۲)

اسلام ایک مکمل دین ہے۔ مولانا آزاد کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ اسلام محض ایک ذہنی تصور اور عقائد وعبادات کا مجموعہ نہیں' بلکہ انسانی زندگی کے لیے ایک مکمل قانون ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور مکمل قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو۔ وہ اپنی توحید تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی' سیاسی ہو یا معاشرتی' دینی ہو یا دنیاوی' حاکمانہ ہو یا محکومانہ' وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا۔ وہ خدا کی آواز اور اس کی تعلیم گاہ کا حلقہ درس ہے۔ جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا ہے وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ اپنے تئیں **امام مبین' حق الیقین' نور و کتاب مبین' تبیانا لکل شیء' بصائر للناس' ھادی' ھدی الی السبیل' جامع اضراب و امثال' بلاغ للناس' حاویٔ بحر و بر** اور اسی طرح کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ اکثر موقعوں پر کہا ہے کہ وہ ایک روشنی ہے اور جب روشنی نکلتی ہے تو ہر طرح کی تاریکی دور ہو جاتی ہے خواہ مذہبی گمراہیوں کی ہو' خواہ سیاسی کی۔'' (۱۳)

مولانا کا مطمح نظر یہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے اعتصام بحبل اللہ المتین کو اپنا نصب العین بنایا تو ان کو دنیا میں بھی کامیابی وکامرانی حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی جنت کے وارث قرار پائیں گے' اور یہی الہلال کی دعوت ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں' خواہ تمدنی وسیاسی ہوں' خواہ اور کچھ' وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی صدا صرف یہی ہے کہ **تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم**' اس کتاب کی طرف آؤ جو ہم اور تم دونوں میں مشترک ہے اور جس سے کسی کو اعتقاداً انکار نہیں۔'' (۱۴)

مولانا واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

''ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لیے بھی قرآن کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے وہ مسلم نہیں' بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم ہے' اس لیے مشرک ہے۔''(۱۵)

الہلال کی دعوت یہ تھی کہ مسلمانوں کی کوئی خواہش ہو' کوئی ارادہ ہو' کوئی تعلیم اور کوئی پالیسی ہو تو صرف قرآن کے اتباع ہی میں حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:

''قرآن پاک دنیا کی سب سے بڑی سعادت ہے جس کے ذریعہ کشورِ انسانیت کی تعمیر از سرِ نو ہوئی' جس نے نیکوں کا ایک لشکر ترتیب دیا' جس نے صدیوں سے پھیلی ہوئی گمراہیوں کو شکست دی اور قرآنی بندگی اور پرستش کی ایک ایسی بادشاہت قائم کی جس کے آگے دنیا کی تمام ماسوا اللہ طاقتیں سرنگوں ہو گئیں۔''(۱۶)

الہلال کی دعوت کلمۃ الحق کی دعوت تھی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ بھلا کسی مسلمان کو اس سے کیونکر انحراف ہو سکتا ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ؒ فرماتے ہیں:

''ہم سب اصلی کام بھولے ہوئے تھے' الہلال نے یاد دلایا۔''

علامہ سید سلیمان ندوی ؒ فرماتے ہیں:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ نے پیدا کیا۔ اور جس اسلوبِ بلاغت' کمال انشاپردازی اور زورِ تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی آیتوں کو پیش کیا اس نے ان کے لیے ایمان و یقین کے نئے دروازے کھول دیے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔''(۱۷)

الہلال کی دعوت تھی کہ اسلام اور جہاد ایک ہی حقیقت ہے' ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

''اسلام اور جہاد ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اور ایک ہی معنی کے لیے دو مترادف الفاظ ہیں اور اسلام کے معنی جہاد ہیں اور جہاد کے معنی اسلام۔ پس کوئی ہستی مسلم نہیں ہو سکتی جب تک وہ مجاہد نہ ہو اور کوئی مجاہد ہو نہیں سکتا جب تک کہ وہ مسلم نہ ہو۔ اسلام کی لذت اس بدبخت کے لیے حرام ہے جس کا ذوق ایمانی لذت جہاد سے محروم ہو اور

زمین پر گو اس نے اپنا نام مسلم رکھا لیکن اس کو کہہ دو کہ آسمانوں میں اس کا شمار کفر کے زمرے میں ہے۔''(۱۸)

الہلال کی خدمات کا اعتراف

مولانا محمد علی جوہر کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے:

''میں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی۔''

مولانا شوکت علی فرماتے تھے:

''ابوالکلام نے ہم کو ایمان کا راستہ دکھایا۔''

اکبر الٰہ آبادی نے الہلال کے مضامین سے متاثر ہو کر لکھا تھا:

فروغِ حق کو نہ ہو گا زوال دنیا میں
ہمیشہ بدر رہے گا ہلال دنیا میں (۱۹)

پنڈت جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار الہلال میں مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا اندازِ تخاطب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔ وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجہ سے واقف تھے اور سرسید' محسن الملک' نذیر احمد اور حالی کے اندازِ بیان کے علاوہ ہوا کا کوئی اور جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا۔ الہلال مسلمانوں کے کسی مکتب خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔''(۲۰)

الہلال کی بندش

۱۸/ستمبر ۱۹۱۳ء کو حادثہ مسجد کانپور کے سلسلہ میں ایک مضمون کی اشاعت پر الہلال سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی جو جمع کرا دی گئی۔ اس کے بعد حکومت بنگال نے الہلال کا ۱۴۔۲۱/اکتوبر ۱۹۱۴ء کا مشترکہ شمارہ ضبط کر لیا۔ ۱۶/نومبر ۱۹۱۴ء کو الہلال سے دس ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی جو جمع نہ کرائی جا سکی اور ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کی اشاعت کے بعد مولانا آزاد نے خود ہی الہلال بند کر دیا۔

البلاغ کا اجراء

الہلال کے بند ہونے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۳/نومبر ۱۹۱۵ء کو البلاغ نکالا' جس میں الہلال ہی کی جھلک نمایاں ہوتی تھی۔ لیکن اپریل ۱۹۱۶ء میں مولانا کے صوبہ بدر

ہونے کی وجہ سے البلاغ بند ہوگیا۔ ۱۰/ جون ۱۹۲۷ء کو الہلال دوبارہ کلکتہ کی بجائے دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا لیکن ۹/ دسمبر ۱۹۲۷ء کو دوبارہ بند کر دیا گیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں:

''اگر مولانا نے اپنا قلمی جہاد جاری رکھا ہوتا تو آج ہماری قوم کو صاف اور سلجھے ہوئے طرزِ فکر اور صحیح راہِ عمل کے تعین میں کسی قدر گراں بہا تقویت نصیب ہوتی۔''

لیکن خود مولانا نے اپنی زندگی کا ماحصل اپنے الفاظ میں اس طرح پیش کیا ہے:

''افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا' غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری کا رونا تھا۔ معلوم نہیں میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔''(۲۱)

قوتِ حافظہ

مولانا ابوالکلام آزاد قدرت کی طرف سے اچھے دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قوتِ حافظہ کی نعمت سے نوازا تھا۔ جو کتاب ایک دفعہ نظر سے گزر جاتی وہ سینہ میں محفوظ ہو جاتی تھی اور اس کو دوبارہ دیکھنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم و مغفور اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد اپنے حافظے کے لحاظ سے قدرت کا ایک عجوبہ تھے۔ قرآن مجید اور احادیث یا خاص مذہبی کتابوں کے سوا انہیں بیشتر علمی و ادبی کتابیں زیادہ سے زیادہ صرف ایک مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا' لیکن ۳۰۔۳۵ سال بعد تک انہیں یہ بھی یاد تھا کہ جو مطلب وہ بیان فرما رہے ہیں وہ اصل کتاب کے دائیں یا بائیں کے صفحے پر کس حصے میں درج ہے۔

مولانا نے 'تذکرہ' میں ایک جگہ امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کے متعلق مولانا فضل رسول بدایونی کی کتاب ''سوط الرحمان'' کا حوالہ دیا ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور ''سوط الرحمان'' دیکھی تو حوالہ غلط نظر آیا' چنانچہ ایک مرتبہ مولانا سے بھی ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے حافظے میں عبارت تو اسی طرح محفوظ ہے جس طرح حوالہ دیا ہے۔ دو تین سال اس معاملے پر گزر گئے' پھر مجھے ''سوط الرحمان'' کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ مل گیا' اس سے واضح ہوا کہ مولانا کا حوالہ کتاب کے پہلے ایڈیشن سے تھا' دوسرے ایڈیشن میں مصنف یا ان کے متعلقین نے عبارت میں ترمیم کر لی تھی اور میرے پاس کتاب کا دوسرا ایڈیشن تھا۔''(۲۲)

دینی مسلک

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی ایک فرد کی زندگی نہیں پورے ایک عہد کی داستان ہے۔

مولانا ایک خاص ذہن اور دماغ کے مالک تھے اور مولانا کو قدرت نے فکر و نظر کی بے شمار دولتوں' علم و فضل کی بے مثال نعمتوں اور بہت سے اخلاقی کمالات سے نوازا تھا۔ مذہب' علوم و فنون' حکمت و فلسفہ' ادب و انشا' شاعری غرض کوئی ایسی وادی نہیں جس کو آپ نے عبور نہ کیا ہو۔ مولانا آزاد عبقری تھے۔ وہ ایک جید عالم دین' مجتہد' فقیہہ' خطیب و مقرر اور مخلص سیاستدان تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مولانا کے دینی مسلک کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا مذہباً سلف صالحین کے مسلک پر استوار تھے اور عقائد میں مسلک سلف سے تجاوز گوارا نہ تھا' لیکن عمل میں بڑے زوردار تھے۔ ہندوستان میں مسلک سلف کے ماننے والے اپنے آپ کو اہلحدیث کہتے ہیں اور عرب ملکوں میں ان کا نام ''سلفی'' ہے۔''(۲۳)

مولانا ابوالکلام آزاد تقلید شخصی کو کسی بھی صورت پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے والد مولانا خیرالدین پیر بھی تھے اور ان کا سلسلہ پیری مریدی کا تھا۔ ہزاروں لوگ ان کے مرید تھے۔ وہ اپنے بڑے بیٹے ابونصر غلام یٰسین آہ کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے' لیکن ۱۹۰۶ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان دنوں اخبار ''وکیل'' امرتسر سے وابستہ تھے۔ مولانا خیرالدین نے مولانا کو لکھا کہ اب تم گھر آ جاؤ اور میرے کام میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ جناب مالک رام لکھتے ہیں:

''یہ وسط ۱۹۰۶ء کی بات ہے جب مولانا آزاد امرتسر میں اخبار ''وکیل'' سے وابستہ تھے۔ مولانا خیرالدین نے انہیں لکھا کہ اب تم گھر آ جاؤ اور کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ یہ ابھی جانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ نومبر ۱۹۰۶ء میں والد نے ایک آدمی امرتسر بھیج دیا کہ انہیں اپنے ساتھ کلکتے لے آئے۔ اب کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا' یہ کلکتے چلے گئے۔ امرتسر کا زمانہ قیام اپریل ۱۹۰۶ء سے نومبر ۱۹۰۶ء تک صرف آٹھ مہینے رہا۔ وہ والد کے حکم کی تعمیل میں مجبوراً کلکتے تو چلے گئے' لیکن سچ یہ ہے کہ وہاں جو کام ان کے سپرد کیا گیا وہ کسی عنوان ان کی پسند کا نہیں تھا۔ مریدوں کی تعلیم و تربیت' پند و وعظ وغیرہ سے وہ کوسوں دور تھے۔ ادھر اخبار نویسی کا مشغلہ ان کا دل پسند کام تھا۔ شیخ غلام محمد (مالک اخبار وکیل) بھی ان کے کام سے ہر طرح مطمئن اور خوش تھے۔ قصہ کوتاہ چند دن بعد انہوں نے والد سے کھل کر کہہ دیا کہ میں اس پیری مریدی کے کاروبار کو جاری نہیں رکھ سکتا' نہ مجھے یہ پسند ہے کہ لوگ آئیں اور میرے ہاتھ پاؤں کو فرطِ عقیدت سے بوسہ دیں۔ والد آدمی سمجھ دار تھے' انہوں نے دیکھ لیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ ان کی مرضی کے خلاف انہیں کسی کام پر مجبور کرنے سے فائدہ؟ انہوں نے اجازت دے دی کہ اچھا اگر یوں ہے تو تم واپس امرتسر جا سکتے ہو۔ اس پر یہ اگست

۱۹۰۷ء میں امرتسر چلے گئے اور دوبارہ اخبار ''وکیل'' کی ادارت کی باگ ڈور ان کے سپرد کر دی گئی۔ لیکن اب ان کی صحت جواب دے گئی' وہ بیمار رہنے لگے۔ سال بھر بھی مشکل سے وہاں رہے اور جولائی/اگست ۱۹۰۸ء میں اخبار ''وکیل'' سے الگ ہو گئے۔'' (۲۴)

تصانیف

مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار صاحب تصانیف کثیرہ میں ہوتا ہے۔ مولانا محمد مستقیم سلفی بنارسی نے مولانا آزاد کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصنیفات کی مجموعی تعداد ۱۲۹ بتائی ہے:

مطبوعہ تصانیف	=	۷۸
غیر مطبوعہ تصانیف	=	۵۱
		۱۲۹

ذیل میں مولانا کی چند مشہور مطبوعہ تصانیف کے ناموں پر اکتفا کیا جاتا ہے:

(۱) ترجمان القرآن (جلد اول) سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الانعام
(۲) ترجمان القرآن (جلد دوم) سورۃ الاعراف تا سورۃ المؤمنون
(۳) تذکرہ
(۴) مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب
(۵) خطباتِ آزاد
(۶) قولِ فیصل
(۷) جامع الشواهد فى دخول غير المسلم فى المساجد
(۸) کاروانِ خیال
(۹) میرا عقیدہ
(۱۰) غبارِ خاطر
(۱۱) ارکانِ اسلام
(۱۲) المرأة المسلمة
(۱۳) صدائے حق
(۱۴) افسانہ ہجر و وصال
(۱۵) شہادت حسینؓ
(۱۶) آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی
(۱۷) مکاتیب ابوالکلام آزاد
(۱۸) نقش آزاد
(۱۹) رسولِ رحمت ﷺ
(۲۰) India Wins Freedom

ترجمان القرآن

ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد کی حواشی قرآن میں ایک بے مثال و بے نظیر تصنیف ہے۔ اس کی پہلی جلد سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الانعام ستمبر ۱۹۳۱ء میں اور دوسری جلد سورۃ

الاعراف تا سورۃ المؤمنون اپریل ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔

سورۃ الفاتحہ کی تفسیر بنام ''اُم الکتاب'' مولانا نے بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم تفسیر سورۃ الفاتحہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سورۃ الفاتحہ کے ایک ایک لفظ کی ایسی دلنشین تشریح اور بصیرت افزا تفسیر ہے کہ اس سے سورہ کے اُم الکتاب (اصل قرآن) ہونے کا مسئلہ مشاہدہ معلوم ہونے لگتا ہے اور اسلام کے تمام مہمات' مسائل اور اصولِ دین پر ایک تبصرہ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً قرآن پاک کے طرزِ استدلال' خالق کائنات کی ربوبیت اور رحمت کے آثار و دلائل اتنی تفصیل سے لکھے ہیں کہ مصنف کی وسعت علم و نظر کی داد بے اختیار دینی پڑتی ہے۔''(۲۵)

جناب مالک رام ترجمان القرآن کے محاسن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ترجمان القرآن قرآن کا ترجمہ اور حواشی ہیں۔ قرآن کے اردو ترجمے بہت ہیں' زیادہ تو نہیں آٹھ دس تو یقیناً خود میری نظر سے گزرے ہوں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو لطف زبان و بیان اور صحت و برجستگی ترجمان القرآن میں ملی وہ الا ماشاء اللہ ان کے کسی پیشرو یا پیرو کے یہاں دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ مترجم کو عربی اور اردو دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہو اور اس کا ادبی ذوق بھی اتنا بلند ہو کہ وہ محض معنی ہی کا خیال نہ رکھے' بلکہ موزونیت مقام اور اردو زبان کے مزاج سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ عربی تو ان کی مادری زبان تھی۔ ذاتی مطالعے اور مشق سے انہوں نے اردو میں بھی اہلِ زبان کی سی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اس پر مستزاد قدرت کی طرف سے انہیں طبع موزوں اور شعر و ادب کا قابل رشک ذوق ودیعت ہوا تھا۔ ان سب باتوں نے مل کر ''ترجمان القرآن'' کو تخلیقی کارنامہ بنا دیا ہے۔''(۲۶)

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی اس شاہکار تصنیف ''ترجمان القرآن'' کے بارے میں فرماتے ہیں:

''کامل ۲۷ برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورۃ' ایک ایک مقام' ایک ایک آیت' ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں۔ تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔ علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں' لیکن میرے لیے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا اور جو

کچھ جدید ہے اس کے لیے اپنی راہیں نکال لیں۔ میرے لیے وقت کی جدید رائیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا ہوں۔

خاندان، تعلیم اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا میں نے اول روز ہی اس پر قناعت کرنے سے انکار کر دیا اور تقلید کی بندشیں کسی گوشے میں بھی روک نہ ہو سکیں۔ اور تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔

میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیے ہیں اور تریاق کے نسخے بھی ہر دارالشفاء کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہ عام پر نہ تھا۔ اس تمام عرصے کی جستجو وطلب کے بعد قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھ چکا ہوں میں نے اس کتاب کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے۔''(۲۷)

ترجمان القرآن کی تیسری جلد شائع نہیں ہو سکی اور اس کا مسودہ بھی اب معلوم نہیں کہ محفوظ ہے یا نہیں۔ مولانا احمد سعید ملیح آبادی بن مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے مجھ سے لاہور میں ذکر کیا تھا کہ ترجمان القرآن کی تیسری جلد کا مسودہ تیار حالت میں انہوں نے مولانا کے پاس دہلی میں دیکھا تھا اور مولانا کی وفات کے بعد ان کے ایک عزیز نورالدین صاحب کے ساتھ کلکتے چلا گیا۔ اس گم شدہ خزانے کا پتا لگانے کی میں نے ہر چند کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی اور دنیا اس نعمت کے دیدار سے محروم رہی۔''(۲۸)

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی بصیرت

تحریک آزادی ہند میں مولانا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ آپ ابتدا ہی سے مسلمانوں کو آزادی کی قومی تحریک میں شامل کرنے کے زبردست حامی تھے اور انہوں نے اس عظیم مقصد کے لیے بہت زیادہ جدوجہد کی۔ مولانا آل انڈیا کانگریس سے وابستہ ہوئے اور اپنی زندگی کے آخری دن تک کانگریس سے وابستہ رہے۔

مولانا تقسیم ہند کے خلاف تھے۔ ان کا موقف تھا کہ تقسیم ملک سے قتل وغارت اور خون

خرابہ ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ تقسیم ہند سے مسلمانوں کا ایک علیحدہ ملک ''پاکستان'' تو معرضِ وجود میں آ گیا، لیکن اس موقع پر قتل وغارت کا وہ بازار گرم ہوا کہ اللہ کی پناہ! لاکھوں مسلمان اور ہزاروں ہندو مقتول ہوئے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد جنگ آزادی کے میر کارواں اور آزاد ہندوستان کے معمار اعظم تھے۔ ان کے کارنامے اتنے گوناگوں ہیں کہ ان کا احاطہ دشوار ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جنگ آزادی کی ابتدا سے لے کر اس وقت تک جتنے نازک مراحل پیش آئے اور جس قدر اندرونی وبیرونی پیچیدہ مشکلات ومسائل پیدا ہوئے ان کو حل کرنے میں مولانا کے تدبر کو بڑا دخل تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب پورا ملک فرقہ پرستی کے سیلاب میں بہہ نکلا تھا تو انہوں نے ہی حکومت کو اس میں گرنے سے بچایا اور دنیا میں ہندوستان کی سیکولرزم کی لاج رکھ لی۔ اگر مولانا کی بصیرت رہنما نہ ہوتی تو معلوم نہیں کہ ہندوستان کس راہ پر پڑ جاتا اور اس کا انجام کیا ہوتا۔ مولانا کی ذات فرقہ پرستی کے خلاف سپر تھی اور ہر فرقہ کو ان پر اعتماد تھا۔''(۲۹)

مولانا ابوالکلام ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۶ء آل انڈیا نیشنل کانگریس کے منتخب صدر رہے۔ ۱۵/ جنوری ۱۹۴۷ء کو عبوری حکومت میں وزارتِ تعلیم کا قلمدان مولانا کو سونپا گیا۔ ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہندوستان کی پہلی حکومت میں وزیر تعلیم کے لیے کانگریس پارلیمانی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر پنڈت جواہر لعل نہرو نے مولانا کا نام پیش کیا جسے بالاتفاق منظور کر لیا گیا۔

وفات

۱۹/ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا پر فالج کا حملہ ہوا اور ۲۲/ فروری ۱۹۵۸ء کو سوا دو بجے شب خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا احمد سعید دہلویؒ نے نماز جنازہ پڑھائی اور جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان اردو پارک میں دفن ہوئے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وادخلہ الجنة الفردوس۔

حواشی

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، ص ۹۸۔

(۲) ابوالکلام آزاد، افضل حق قرشی، ص ۳۸۰۔

(۳) ابوالکلام آزاد، افضل حق قرشی، ص ۲۲۸۔

(۴) مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، ص ۶۶۔

(۵) مولانا ابوالکلام آزاد‘ ص ۶۷۔
(۶) کچھ ابوالکلام کے بارے میں‘ مالک رام‘ ص ۲۹۔
(۷) ابوالکلام آزاد‘ مرتبہ عبداللہ بٹ‘ ص ۹۲۔
(۸) علامہ سید سلیمان ندوی‘ شخصیت وادبی خدمات‘ ص ۳۴۸۔
(۹) مولانا ابوالکلام آزاد‘ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری‘ ص ۱۴۳۔۱۴۴۔
(۱۰) کچھ ابوالکلام کے بارے میں‘ ص ۶۱۔
(۱۱) کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں‘ ص ۶۳۔
(۱۲) الہلال‘ ۲۲/دسمبر ۱۹۱۲ء۔
(۱۳) الہلال‘ ۸/ستمبر ۱۹۱۲ء۔
(۱۴) الہلال‘ ۸/ستمبر ۱۹۱۲ء۔
(۱۵) الہلال‘ ۸/ستمبر ۱۹۱۲ء۔
(۱۶) الہلال‘ ۱۵/اگست ۱۹۱۲ء۔
(۱۷) معارف اعظم گڑھ‘ اکتوبر ۱۹۳۲ء‘ ص ۳۱۲۔
(۱۸) الہلال‘ ۲۷/نومبر ۱۹۱۲ء۔
(۱۹) الہلال‘ ۱۸/اگست ۱۹۱۲ء۔
(۲۰) ڈسکوری آف انڈیا‘ بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد‘ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری‘ ص ۱۸۰۔
(۲۱) مولانا ابوالکلام آزاد‘ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری‘ ص ۱۸۱۔
(۲۲) مولانا ابوالکلام آزاد‘ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری‘ ص ۷۹۔
(۲۳) ذکر آزاد‘ ص ۱۳۴۔
(۲۴) کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں‘ ص ۵۷۔۵۸۔
(۲۵) ابوالکلام آزاد‘ ادبی وشخصی مطالعہ‘ افضل حق قرشی‘ ص ۴۴۵۔
(۲۶) کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں‘ ص ۶۷۔۶۸۔
(۲۷) ترجمان القرآن‘ ج ۲‘ ص ۱۸‘ ۱۹۔
(۲۸) مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے‘ خلیق انجم‘ ص ۳۶۰۔
(۲۹) معارف اعظم گڑھ‘ مارچ ۱۹۵۸ء۔

❁❁❁

اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت

ترتیب و تلخیص: سید محمد افتخار احمد

جناب رشید اللہ یعقوب نے ایک کتاب ”اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ“ میں قرآن وسنت کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ مسلمان اپنے معبود ”اللہ“ کو اللہ تعالیٰ ہی پکاریں‘ اور گفتگو میں استعمال کریں۔ دوسری کسی زبان مثلاً اردو‘ فارسی‘ ہندی اور انگریزی وغیرہ میں بھی اللہ کے سوا کوئی اور لفظ استعمال نہ کریں۔ میں افادۂ عام کے لیے اس کتاب کی تلخیص انتہائی اختصار سے پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری تمام مسلمانوں سے گزارش ہے کہ خدا کے لفظ کو ترک کر کے اللہ کا لفظ استعمال کریں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ آمین! اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ ۚ﴾ (آل عمران)

”کہہ دو کہ اللہ اور رسول (ﷺ) کا حکم مانو۔“

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَلَا تُبۡطِلُوۡۤا اَعۡمَالَکُمۡ ﴿۳۳﴾﴾ (محمد)

”اے ایمان والو! اللہ کا حکم مانو اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ ہونے دو۔“

﴿مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ وَمَنۡ تَوَلّٰی فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ﴿۸۰﴾﴾ (النساء)

”جو شخص رسول (ﷺ) کی اطاعت کرے گا تو بے شک اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور جو روگردانی کرے تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔“

﴿لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَالۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا ﴿۲۱﴾﴾ (الاحزاب)

”یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ میں عمدہ نمونہ موجود ہے‘ اس شخص کے لیے جسے اللہ (سے ملنے) اور روزِ قیامت (کے آنے) کی اُمید ہو اور وہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔“

﴿اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَلَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۳﴾﴾ (الاعراف)

”(اے لوگو) جو (کتاب) تم پر تمہارے رب کے ہاں سے نازل ہوئی ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا اور رفیقوں کی پیروی نہ کرو۔ کم ہی نصیحت ہے جو تم قبول کرتے ہو۔“

مندرجہ بالا آیات کے مطابق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اپنے عمل سے اللہ کی اطاعت کا نمونہ بن کر دکھا دیا‘ لہٰذا ہمیں رسول اللہ ﷺ کے ہر عمل میں اتباع کرنا لازمی ہے۔ تو برادرانِ اسلام! ذرا غور فرمایئے کہ کیا آپ پیرویٔ سنتِ رسول اللہ ﷺ میں اپنی تحریروں‘ تقریروں اور روزمرہ گفتگو میں سنتِ مؤکدہ کے مطابق لفظ اللہ کا ہی استعمال کرتے ہیں یا خدا اور God کا۔ اگر بحیثیت مسلمان آپ لفظ اللہ کا ہی استعمال کرتے ہیں تو مبارک ہو‘ آپ متذکرہ بالا آیات کے مطابق اللہ تعالیٰ کے انعام کے حق دار بن گئے۔ لیکن اگر آپ نے اس سنتِ مؤکدہ کو ترک کر دیا‘ یا اس کی چنداں پروا نہ کی تو آپ اس آیت کا مصداق ٹھہر سکتے ہیں: ﴿وَذَرُوا الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اَسۡمَآئِہٖ ؕ﴾ (الاعراف: ۱۸۰) ”اور ان لوگوں (کے طریق) کو چھوڑ دو جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الحاد اختیار کیا ہے“۔ سورۃ الاحزاب کی یہ آیت بھی ملاحظہ فرمایئے: ﴿اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ﴾ (آیت ۶) ”نبی ﷺ مؤمنوں پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں“۔ اور یہ متفق علیہ حدیث بھی ملاحظہ فرمالیجیے: ((لَا یُؤۡمِنُ اَحَدُکُمۡ حَتّٰی اَکُوۡنَ اَحَبَّ اِلَیۡہِ مِنۡ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ)) ”تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک کامل ایمان والا ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ میری ذات اس کے نزدیک اپنے والد‘ اپنی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہیں ہو جاتی۔“

تو کیا وجہ ہے کہ آپ اپنی زندگی میں باقی سب کاموں کے لیے تو سنتِ رسولؐ پر عمل کی کوشش کرتے ہیں‘ مگر ایک غلط الاستعمال لفظ کو چھوڑنے کے لیے سنتِ رسولؐ کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ کیا یہی اطاعت اللہ اور اتباعِ رسول اللہ ﷺ ہے؟ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا: ”اے لوگو میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں‘ جب تک ان کو مضبوطی سے پکڑے رکھو گے کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت“۔ اور ہم نے سنتِ رسولؐ سے اچھی وفاداری نبھائی کہ عباسی دور کے بعد ہی اللہ کو خدا کہنا شروع کر دیا۔

مسلمانوں کے ''اللہ'' پر مجوسیوں' آتش پرستوں کے ''خدا'' کو فوقیت دینے لگے۔

مسلمانوں نے ہندوستان پر قریباً ایک ہزار سال حکومت کی۔ شاباش ہے محکوم قوم ہندو پر کہ انہوں نے اپنے بھگوان' ایشور اور برہما کو خدا یا اللہ کہہ کر نہیں پکارا۔ مگر فارس' خراسان اور ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ فخر حاصل ہوا کہ فاتح قوم ہونے کے باوجود انہوں نے اللہ وحدہ لاشریک کے لیے مجوسیوں کے دو خداؤں میں سے ایک کا نام اختیار کر لیا۔

ہم عبادت کرتے ہیں اللہ کے رسول ﷺ کے طریقے پر' مگر دعا مانگتے ہیں اللہ کی بجائے مجوسیوں کے خدا سے۔ نماز پڑھیں' روزہ رکھیں' زکوۃ ادا کریں' حج کریں' سب کچھ حضور ﷺ کی سنت کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں' مگر پتا نہیں کہاں مت ماری جاتی ہے کہ اردو' پنجابی' پشتو' سندھی اور بلوچی میں دعا مانگتے ہیں تو آتش پرشتوں کے خدا سے۔ ہمارے لیے جو ہے ہی باطل خدا وہ ہمیں کیا ہدایت دے گا؟ اگر ہم ایک عام آدمی کو نظر انداز بھی کر دیں تو اس عالم کا کیا کریں جو منبرِ رسولؐ پر بیٹھا اپنے خطاب میں خدا خدا کی گردان کر رہا ہے۔ عام آدمی بیچارہ اسی کو سُن کر تو تقلید میں خدا خدا کی گردان کرے گا۔ یہ بات تو ہمارے علماء کرام کے سمجھنے کی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سنتِ مؤکدہ کا اتباع کریں۔ علماء کرام کو چاہیے کہ اس فرمانِ الٰہی کو ہمیشہ یاد رکھیں: ﴿اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (المائدۃ) ''تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے' اس وقت وہ تم کو تمہارے سارے کاموں سے جو تم (دنیا میں) کرتے رہے تھے' آگاہ کر دے گا۔''

ماضی میں لفظ خدا کا استعمال فارسی کا سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے غلط العام ہو گیا تھا۔ اردو بھی چونکہ اسی زمانہ میں نئی زبان کے طور پر معرضِ وجود میں آئی تھی اس لیے ہمارے خواص و عام اس لفظ کے عادی ہو گئے۔ اب جبکہ زمانہ حال میں ہمارے پاس فتاویٰ بھی موجود ہیں کہ:

(۱) اللہ تعالیٰ کے اسمِ ذات کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) قرآن و حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ ہی کہنا افضل ہے۔

تو ہر خواص و عام کو اپنی زندگی میں' اپنی تحریر و تقریر اور گفتگو میں اللہ تعالیٰ ہی کہنا چاہیے' خدا نہیں۔ افضل کو چھوڑ کر ادنیٰ کے استعمال پر مُصر رہنا تو یہود کی سنت ہے۔ (البقرۃ:۶۱)

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں جزیرۃ العرب میں مجوسی' یہودی' عیسائی اور بت پرست موجود تھے۔ مجوسی اپنے معبودوں کو ''اہورا مزدا' یزداں اور خدا'' کے نام سے پکارتے اور ان

کی عبادت کرتے تھے۔ یہودی اپنے معبود کو ''یَھْوِہ'' (YAHWEH) کے نام سے پکارتے اور اس کی عبادت کرتے تھے۔ عیسائی اپنے تثلیثی معبود ''ڈیوس (DEUS) یا تھیوس (THEOS)' غیر عیسائی یورپین (God) کے نام سے پکارتے اور اس کی عبادت کرتے تھے۔ بت پرستوں کے تو بے شمار معبود تھے۔ ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: ''یہ اس لیے کہ اللہ کی ذات ہی برحق ہے۔ اور جن کو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے (اور عبادت کرتے) ہیں وہ باطل ہیں۔ اور یہ کہ اللہ ہی رفیع الشان اور گرامی قدر ہے''۔ (لقمٰن:۳۰' الحج:۶۲) یعنی معبود تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات برحق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور معبود کو پکارنا اور عبادت کرنا بالکل باطل ہے۔ جن معبودوں کو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے باطل قرار دیا' ان کے نام خدا یا God آج حق تعالیٰ کے لیے کیسے جائز ہو گئے؟

جہاں کہیں رسول اللہ ﷺ نے ''وَاللّٰہِ'' فرمایا ہے بعض علماء اس کا ترجمہ بھی ''خدا کی قسم'' کرتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچتے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے کیا منسوب کر رہے ہیں؟ حالانکہ ''وَاللّٰہِ'' کا ترجمہ ''اللہ کی قسم'' بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے اس عمل سے ایک عام مسلمان یہ تاثر لیتا ہے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے بھی ''خدا کی قسم'' کہا تھا' جو سراسر غلط ہے۔ کیا یہ ''رسول اللہ ﷺ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے'' کے زمرے میں نہیں آتا؟ قرآن مجید کی آیات البقرۃ:۱۶۳' الانعام:۱۰۲' الحج:۶۲' القصص:۷۰' لقمان:۳۰' الحشر:۲۲' الاخلاص:۱' اور ان جیسی دیگر آیات کی تعمیل میں رسول اللہ ﷺ' خلفاء راشدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' تابعینؒ' تبع تابعینؒ' ائمہ اربعہؒ نے ساری زندگی اللہ تعالیٰ کو صرف اللہ تعالیٰ ہی کہا۔ نہ خود نہ کسی نو مسلم کو کسی ایسے نام سے پکارنے کی اجازت دی جو کفار و مشرکین کے معبود مثلاً خدا' گوڈ' تھیوس' ڈیوس' بھگوان' برہما یا بدھا وغیرہ وغیرہ تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جو پیدائشی مجوسی تھے وہ خدا کے نام سے واقف تھے۔ عیسائی ہوئے تو ڈیوس یا تھیوس کے نام سے واقف ہوئے۔ مسلمان ہوئے تو اللہ کے نام سے واقف ہوئے۔ انہوں نے بقیہ ساری زندگی اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ ہی پکارا۔ کیونکہ یہی سنتِ رسولؐ تھی' ہے اور رہے گی۔

ربّ العزت سے التجا ہے کہ وہ ہمیں سیدھے راستے پر قائم رکھے تاکہ ہم نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل پر کاربند رہنے اور افضل عمل کرنے کی جدّوجُہد کرتے رہیں۔ آمین ثم آمین!

حقوق وفرائض کی دُنیوی سطح پر چند مثالیں

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

گزشتہ تحریروں میں حقوق وفرائض کے حوالے سے جو گفتگو ہوئی ہے وہ حقوق اللہ (یعنی اللہ کے حقوق اور فرائض' حقوق القرآن اور حقوق الرّسول ﷺ) پر مشتمل تھی' جو دراصل اللہ اور بندے کے درمیان حقوق وفرائض کی ایک کڑی ہے۔ جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے تو وہ بھی درحقیقت انسانوں پر اللہ ہی کی طرف سے عائد کردہ فرائض ہیں جن کا ادا کرنا اس ذاتِ باری تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے۔ حقوق العباد کو ادا کرنا اتنا ضروری اور اہم اس لیے ہے کہ حقوق العباد میں حق تلفی یا عدم ادائیگی کی صورت میں ہم اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگیں تو معافی نہیں ملے گی جب تک کہ جس کا حق تلف ہوا ہے وہ ہمیں معاف نہ کر دے۔ یاد رہے کہ توبہ کی شرائط میں چوتھی شرط بھی یہی ہے کہ اگر کسی انسان کا حق مارا ہے تو اس کی تلافی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ اگرچہ غفور ورحیم ہے' رحمٰن ہے' اور وہ اپنے بندوں کو سچی توبہ پر معاف کرنے پر پوری طرح قادر ہے' لیکن اللہ حقوق العباد خود سے معاف نہیں کرے گا۔ حقوق العباد کی اہمیت واضح کرنے کے لیے نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم ملاحظہ ہو۔ اس کو پڑھتے ہوئے یہ ضرور سوچیں کہ حقوق کی عدم ادائیگی اور حق تلفی ہمیں کیسے آسمان سے زمین پر گراتی ہے اور ہم کیسے جنتی سے دوزخی بن سکتے ہیں۔

مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ مفلس کسے کہتے ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ہماری نظر میں مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس مال ودولت نہ ہو' کھانے کو روٹی نہ ہو' پہننے کو لباس نہ ہو اور رہنے کو گھر نہ ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میری اُمت کا مفلس وہ ہے جو اللہ کے حضور اس حال میں لایا جائے گا کہ اس کے پاس نیکیوں کا ڈھیر ہوگا (نماز' روزے' نوافل' تسبیحات وغیرہ) اور اس کے اعمال تولنے کے لیے ترازو قائم کیا جائے گا۔ اس کی نیکیاں ایک پلڑے

میں ڈالی جائیں گی تو نیکیوں والا پلڑا بھاری ہوگا' لیکن اسی دوران بہت سے دعوے دار اس کے آس پاس جمع ہو جائیں گے۔ اس شخص نے کسی کا مال کھایا ہوگا' کسی کو گالی دی ہوگی' کسی کا حق مارا ہوگا' کسی کی عیب جوئی کی ہوگی' کسی کا تمسخر اڑایا ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ اس شخص کی نیکیاں ان لوگوں میں بانٹ دی جائیں جن کے حقوق اس نے دنیا میں تلف کیے تھے۔ آہستہ آہستہ اس شخص کی تمام نیکیاں آس پاس کھڑے دعوے داروں میں تقسیم کر دی جائیں گی' لیکن ابھی اور مزید دعوے دار کھڑے ہوں گے' تو ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ اس شخص کی زیادتی کے بدلے میں دعوے داروں کے گناہ اس کے پلڑے میں ڈال دیے جائیں۔ (پھر ایسا ہی ہوگا کہ دعوے داروں کے گناہ اس نیک' عابد' زاہد شخص کے پلڑے میں ڈال دیے جائیں گے۔) بالآخر وہ شخص جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ ہے میری امت کا مفلس شخص —— (اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت کاملہ عطا فرمائے!)

معاملاتِ انسانی میں جب تک عدل وانصاف سے اپنے فرائض ادا نہ کیے جائیں تو دنیا اور آخرت میں خسارہ ہی خسارہ ہے اور حقوق وفرائض کی صحیح نشاندہی پر اپنے فرائض ادا کرنا دنیا اور آخرت میں برگ وبار پیدا کرتا ہے۔ حقوق العباد کو سمجھانے کے لیے ابتدا میں چند ایسی مثالیں دی جاتی ہیں جن کا تعلق ہماری روزمرہ زندگی سے ہے اور ان میں عدم توازن کی وجہ سے آج ہمارا سارا معاشرہ بدنظمی کا شکار ہے۔ اپنی ڈیوٹی میں کوتاہی سے ہم سب نہ صرف عدم تحفظ کا شکار ہیں بلکہ جان ومال بھی محفوظ نہیں ہیں۔ ان مثالوں کے ذریعے سے اصل مدعا بیان کرنے میں آسانی بھی ہوگی اور ع ''شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات'' کے مصداق فرض کی اہمیت' فرضیت اور ذمہ داری کا احساس اور شعور بھی بیدار ہوگا۔ اور پھر اپنے فرائض اور دوسروں کے حقوق ادا کر کے عافیت' سکون اور اطمینان نصیب ہوگا' ان شاء اللہ!

(۱) ایک ڈاکٹر کے فرائض

ایک ڈاکٹر کا فرض ہے کہ اپنے مریض کے مرض کی صحیح تشخیص اور درست علاج کا معقول قیمت میں بندوبست کرے۔ اچھا رویہ اور اچھا اخلاق اس کے فرض اور ڈیوٹی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ اگر ڈاکٹر مرض کی صحیح تشخیص اور مناسب دوا دینے میں لاپرواہی یا کوتاہی کا مرتکب ہے تو وہ اپنے فرض سے غفلت برت رہا ہے۔ جلد ہی یہ حقیقت ہر ایک کے سامنے واضح ہو جائے گی اور پھر مریض وہاں نہ جانے میں ہی عافیت سمجھیں گے۔ ڈاکٹر کا اپنے فرض میں غفلت کرنا ایک

بہت بڑا جرم ہے اور اس سے مریض بجائے صحت یاب ہونے کے موت کے منہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ایک ڈاکٹر کے فرائض اور مریض کے حقوق ہیں‘ جبکہ مریض کا فرض یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر کو اپنی تکلیف پوری دیانت داری سے بتائے‘ ڈاکٹر کی ہدایت اور نسخے پر پوری طرح عمل کرے اور جو معاوضہ طے ہوا ہے وہ دیانت داری سے ادا کرے۔ یہ ڈاکٹر کا حق اور مریض کا فرض ہے۔ ڈاکٹر اگر نماز‘ روزہ اور دوسری نیکیاں تو کمارہا ہو‘ لیکن اپنے اصل فرض اور ڈیوٹی میں غفلت برت رہا ہو جس کی وجہ سے بہت سے مریض ناحق موت کے منہ میں چلے جائیں یا صحت یاب ہونے کی بجائے مزید بیمار ہو جائیں تو ماقبل بیان کردہ مفلس والی حدیث ذہن میں لے آئیں کہ قیامت کے دن کتنے مریض اس ڈاکٹر کا گریبان پکڑنے کو تیار ہوں گے‘ اس ڈاکٹر کی تمام نیکیاں ان مریضوں کو دے دی جائیں گی۔ یہ اس وجہ سے ہوگا کہ ڈاکٹر نے اپنے فرض کی دیانت داری سے ادائیگی نہیں کی۔

(۲) ٹریفک وارڈن کی ذمہ داری

ٹریفک وارڈن ہمارے معاشرے کا ایک نہایت اہم فرد ہے جس کے ذمے انسانی جانوں کی حفاظت‘ گاڑیوں کو حادثات سے بچانا اور پوری ٹریفک کے نظام کو اچھے اور صحیح اصول وضوابط کے مطابق کنٹرول کرنا ہے۔ گرمی اور سردی کی پروا کیے بغیر اس سخت ڈیوٹی کو ایک مخصوص یونیفارم کے ساتھ انتہائی ذمہ داری‘ ہوشیاری اور دیانت داری سے ادا کرنا اور ڈیوٹی کے اوقات کے ساتھ انصاف کرنا یہ سب اس کے اپنے فرائض ہیں جو اس کو لازماً پورے کرنے ہیں۔ فرض کیجیے ایک ٹریفک وارڈن بہت زاہد اور عبادت گزار ہے‘ راتوں کو اللہ کے حضور کھڑا بھی رہتا ہے اور دن کے اوقات میں مسجد بھی وقت سے پہلے پہنچنے کی کوشش کرتا ہے‘ نماز اور نوافل ادا کرنے میں اسے دیر بھی لگ جاتی ہے‘ مزید یہ کہ تبلیغ دین کے لیے بھی کہیں نہ کہیں مصروف رہتا ہے۔ نیکی کے یہ تمام کام بہت خوب ہیں اور یہ تمام جذبے قابل قدر بھی ہیں۔ لیکن اس کے نتیجے میں لامحالہ اس کی اپنی ڈیوٹی اور اس کا اپنا ذاتی فرض نہ صرف بہت بری طرح متاثر بھی ہو رہا ہے بلکہ اس سے حادثات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر لوگوں میں بدنظمی بڑھتی جاتی ہے اور آگے بڑھنے کی دوڑ میں ٹریفک اشاروں کی پروا کیے بغیر اکثر لوگ جب اشارہ کاٹ کر آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ پیدل سڑک پار کرنے والوں اور فٹ پاتھ پر چلنے والوں کو بھی جان کا

خطرہ اور دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یہ ٹریفک وارڈن خود اپنے تئیں بہت نیک کام میں مصروف ہے‘ لیکن یہ سراسر اپنے فرائض سے غفلت اور لوگوں کی جانوں سے کھیلنے والی بات ہے‘ جس کی سزا اسے ضرور ملنی چاہیے اور اس کو اس کی ڈیوٹی سے فارغ کر دینا چاہیے۔

(۳) کلاس ٹیچر کی اپنے فرض سے کوتاہی

ایک ٹیچر اس ذمہ داری پر سکول آتی ہے کہ اسے بچوں کی تعلیم اور نصاب کی تکمیل کرانی ہے اور بچوں کو ایک بااخلاق انسان بنانے کی کوشش کرنی ہے۔ چند دن تو یہ ٹیچرز بڑی مستعدی سے اپنا فرض نبھاتی ہیں‘ لیکن جب پاؤں جم جاتے ہیں تو کلاس میں آتے ہی غائب ہو جاتی ہیں۔ دوسری ٹیچرز کے ساتھ خوش گپیاں‘ گھروں کی چغلیاں‘ حالات کی ناسازی کی شکایتوں میں اتنا مصروف ہوتی ہیں کہ پیریڈ کا وقت ختم ہو جاتا ہے لیکن ان کی باتیں ختم نہیں ہوتیں۔ بچوں کو پڑھائے بغیر ڈھیر سارا کام دے دینا یا پھر کلاس کی ذہین بچی یا بچے کو مانیٹر کی سیٹ پر بٹھا کر اس کا بھی مستقبل خراب کرنا ان کی عادت بن جاتا ہے۔ امتحان کے نزدیک بچوں پر سختی اور مار کٹائی شروع کر دیتی ہیں‘ لیکن اپنے فرض کی ادائیگی کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتیں۔ بچوں کو اشاروں‘ اشاروں میں اہم ترین سوالات جو امتحان میں آئے ہیں‘ ان کی نشاندہی کر دیتی ہیں۔ سارا سال تو جیسے تیسے کر کے گزر جاتا ہے آخر کار برا رزلٹ آنے پر اُن ٹیچر کا پول کھل جاتا ہے اور وہ سکول سے نکال دی جاتی ہیں۔ یہ تو ان کو ان کے فرض میں کوتاہی کی نقد سزا مل گئی‘ لیکن اللہ کے ہاں ان کی سزا ابھی باقی ہے کہ جب بچے ان کے گریبان پکڑیں گے۔

حقوق وفرائض کے ضمن میں مندرجہ بالا تین مثالوں جیسی مثالیں ہمارے معاشرے میں جابجا نظر آئیں گی۔ حکومت اور بادشاہت سے لے کر ایک ملازم تک حقوق وفرائض کا وسیع و عریض دائرہ ہے جس میں انسان بندھا ہوا ہے۔ ایک پرامن معاشرے سے لے کر ایک گھر تک کو پرسکون بنانے کے لیے شریعت نے حقوق وفرائض کی جو حدود وقیود متعین کی ہیں اگر ہم سب سے پہلے ان پر کاربند ہو جائیں تو ہمارے معاشرے سے لڑائی جھگڑے‘ بدزبانیاں‘ بدگمانیاں بدامنی اور خودغرضی جیسی مہلک بیماریاں‘ جو حقوق وفرائض سے غفلت کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں‘ ختم ہو جاتی ہیں۔ ہر فرد کی یہ بھی کوشش ہو کہ وہ اپنے فرض اور اپنی ڈیوٹی پر نظر رکھے نہ کہ دوسرے کو اپنی ذمہ داریاں سمجھانا شروع کر دے کہ تم نے یہ بھی کرنا ہے اور وہ بھی۔ اس کے ساتھ ہر فرد کی یہ بھی خواہش ہونی چاہیے کہ میں دوسرے کی حق تلفی سے بچ جاؤں اور دوسروں

کے حقوق پورے پورے ادا کرسکوں۔

ایک پرسکون معاشرے کی دوسری بڑی نشانی حسن سلوک ہے کہ ہم اپنے فرض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ دوسروں سے حسن سلوک یا عفوو درگزر کی توقع رکھنے کی بجائے یہ کام ہم خود بغیر کسی غرض کے کریں اور اس کا اجر صرف اور صرف اللہ سے مانگیں۔ اگر اپنے فرائض کی ادائیگی اچھے طریقے‘ حسن سلوک اور حسن اخلاق کے ساتھ ہو تو یہ یقیناً سونے پہ سہاگا کا کام کرے گا۔

انسانوں کے مابین حقوق وفرائض

والدین کے حقوق

قرآن حکیم میں حقوق وفرائض کے ضمن میں والدین اور اولاد کے درمیان اور شوہر اور بیوی کے مابین حقوق وفرائض بار بار بیان ہوئے ہیں۔ حقوق العباد میں سب سے مقدم والدین کے حقوق ہیں۔ قرآن پاک میں عام طور پر جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے حقوق کا تذکرہ آیا ہے وہاں والدین کا تذکرہ ساتھ ہی آیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ ۟ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ (آیت ۸۳)

’’اور (یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم نہیں عبادت کرو گے سوائے اللہ کے اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو گے۔‘‘

سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا:

﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ؕ﴾ (آیت ۲۳)

’’اور فیصلہ فرما دیا آپ کے رب نے کہ تم اُس کے سوا کسی کی بندگی مت کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔‘‘

اس کے علاوہ سورۃ الانعام کی آیت ۱۵۱ میں فرمایا:

﴿......اَلَّا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ۚ﴾

’’......کہ تم شریک نہ ٹھہراؤ اس (اللہ) کے ساتھ کسی کو بھی اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔‘‘

قرآن کریم میں والدین سے نیکی اور بھلائی کرنے کے ضمن میں احسان کا لفظ آیا ہے جو

حسن سلوک کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ اور حدیثِ مبارکہ کے مفہوم کے مطابق کہ ’’تم زندگی میں اپنے والدین کے احسانات کا بدلہ اتار ہی نہیں سکتے‘‘۔ اس مقام تک تو پہنچنا واقعی ناممکن ہے کہ ہم والدین کے احسانات کا دنیا میں کوئی بدل دے سکیں۔ نہ ہم ان کو وہ پیار محبت دے سکتے ہیں جو انہوں نے ہمیں دیا اور نہ ہم ایک رات یا ایک دن وہ بے لوث اور بے غرض ایثار و قربانی کر سکتے ہیں جو انہوں نے راتوں کو جاگ کر‘ اپنی نیندیں خراب کر کے ہماری نذر کر دیں اور دن کی تمام مشقت اور بھاگ دوڑ اپنی ذاتی مصروفیات کو پس پشت ڈال کر اپنی اولاد کی خدمت‘ ان کی من پسند خواہشات کو پورا کرنے اور ان کی دنیوی تعلیم کی نذر کر دی۔ (یہ ہمارا المیہ ہے کہ ہم دنیا کی تعلیم ہی کو مدنظر رکھتے ہیں اور دنیا ہی ہمارا مطمح نظر ہوتی ہے اور اسی کی تکمیل پر والدین کی اوّلین نظر ہوتی ہے۔) والد کی زندگی اور جوانی کا بہترین دور پیسے کی شکل میں اولاد کو پالنے میں لگتا ہے جو جسمانی مشقت کا ایک حصہ ہے اور والدہ کی زندگی‘ خصوصاً والدہ کی جوانی کا بہترین دور تربیت اولاد‘ ایثار و قربانی‘ پیار محبت اور کھلانا پلانا اور پکانا گویا گھر گرہستی کی نذر رہتا ہے جو جسمانی مشقت کا دوسرا رخ ہے۔

والدین کی سعی و جہد اور محبت کا مرکز و محور اولاد ہی ہوتی ہے‘ یہاں تک کہ وہ دونوں بڑھاپے کی دہلیز تک جا پہنچتے ہیں۔ اپنے اندر ہمتیں‘ توانائیاں ختم ہو رہی ہوتی ہیں لیکن اولاد سے محبت کا رشتہ کم نہیں ہوتا‘ البتہ محبت کا رخ بدلنا شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے کمزور اور ناتواں اولاد کو جواں والد اور والدہ بے انتہا محبت سے ہر طرح کا بے لوث سہارا دیتے تھکتے نہیں تھے اور اب کمزوری اور ناتوانی والدین کے گرد گھیرا ڈال دیتی ہے تو وہ زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لیے اولاد کے مضبوط ہاتھوں اور سہارے کے منتظر ہوتے ہیں۔ اپنی محبتوں کا بدل نہیں مانگتے لیکن اولاد کے نرم رویے اور اچھے اخلاق کے متمنی بھی ہوتے ہیں اور محتاج بھی۔ والدین اولاد کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے کہ کہیں چوٹ نہ لگ جائے‘ گر نہ جائے‘ گم نہ ہو جائے‘ کوئی فضول چیز منہ میں نہ ڈال لے وغیرہ وغیرہ۔ اب خود ان کو ضرورت ہے کہ اولاد ان کی نگرانی کرے کہ کہیں کسی جگہ پھسل نہ جائیں‘ کہیں بیمار نہ ہو جائیں۔ والدین اپنی اولاد کی بغیر ضرورت کے بھی پوری دیکھ بھال کرتے تھے‘ لیکن اب والدین کو ضرورت ہے کہ ان کی اولاد اب ان باتوں کا خیال رکھے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارذل العمر سے پناہ مانگی ہے اور وہ ارذل العمر ہی ہے کہ جب اپنے اعضاء ڈھیلے ہو جاتے ہیں‘ نظر و سماعت ساتھ دینا چھوڑ

جاتی ہے‘ جب عقل پر جذبات غالب آنے شروع ہو جاتے ہیں اور باوجود کوشش کے بھی بسا اوقات اپنے کاموں تک کو کرنے سے لاچار ہو جاتے ہیں۔ یہی اولاد کے امتحان کا وقت ہے کہ جب اولاد کے پاس وقت نہیں‘ کچھ وقت گھر سے باہر‘ کچھ بیوی بچوں کی نذر اور کچھ اپنے دوستوں اور اپنے مشاغل میں مصروف رہ کر گزارتے ہیں۔ والدین کے اگر پورے دن رات کے اکثر اوقات اپنے بچوں کی نذر ہوئے تھے اور وہ اپنے ضروری کام بھی ایک طرف کر کے اولاد کی خدمت کرتے تھے تو آج اولاد کے پاس ۲۴ گھنٹوں میں سے دو گھنٹے بھی ایسے نہیں ہیں کہ وہ خلوص سے والدین کے پاس گزاریں۔ والدین اپنی تھکاوٹ اور نیند کی کمی کے باوجود بھی اولاد کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے تھے‘ جبکہ آج اولاد اگر والدین کے کام آ ہی جاتی ہے تو احسان بھری نظروں سے والدین کو جتانے کی کوشش کرتی ہے کہ میں نے آپ کے اتنے کام کیے ہیں‘ اب زیادہ مطالبے نہ کرنے شروع ہو جائیں۔

یہ تو والدین کے احسانات کی بس ایک جھلک ہے۔ اس کو پڑھ کر کیا ہم میں سے کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے والدین سے بہت پیار کرتا ہوں یا میں اپنے بیوی بچوں اور اپنی مصروفیات کے باوجود بھی ان کو وقت دیتا ہوں؟ کیا کوئی ماں سے یہ کہتا ہے کہ مجھے آپ کے کام کر کے کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی بلکہ مجھے تو بہت سکون ملتا ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہم پر جو فرائض اللہ کی طرف سے اپنے والدین کے عائد ہوتے ہیں ہم تو وہ بھی ادا نہیں کرتے۔ اولاد کے غلط طرزِ عمل اور والدین کی ہر وقت کی حق تلفیوں اور غفلتوں کے باوجود اللہ ربّ العزت نے والدین کے حق میں دعائیں ہماری نماز کا حصہ بنا دی ہیں۔ حالانکہ بیٹوں کو اپنی مصروفیات اور بیٹیوں کو اپنی پڑھائی سے فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے والدین کی طرف بھی توجہ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کے بعد والدین کا حق رکھ دیا ہے۔ گویا فرائض ادا کرنے کے بعد والدین کی خدمت کرنا فضیلت کے اعتبار سے نوافل ادا کرنے کی نسبت افضل ہے‘ جبکہ اس فرض کی ادائیگی کا اولاد کو کوئی علم نہیں۔ اگرچہ اس میں والدین کا بھی قصور ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اپنے حقوق بالکل نہیں بتاتے‘ ہاں جب بیٹوں کی شادیاں ہو جاتی ہے اور بیویوں کی طرف ان کی توجہ بڑھنے لگتی ہے تو والدین کو اپنے حقوق یاد آنے لگتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ جب پانی کافی حد تک سر سے گزر چکا ہوتا ہے‘ کیونکہ مردوں کے اندر بیویوں اور اولاد کی محبت ڈال دی گئی ہے۔ قرآن پاک نے بیویوں اور اولاد کو تو فتنہ کہا ہے‘ لیکن والدین کے بارے میں نہ

صرف یہ کہ فتنہ جیسا کوئی لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس ان کے حق کے بارے میں تفصیلی احکامات آئے ہیں۔ افسوس اور دکھ کا ایک مقام یہ بھی ہے کہ ہمارا معاشرہ جو ہم سے ہی وجود میں آیا ہے‘ بیٹیوں کو اپنے والدین کی خدمت سے بری قرار دیتا ہے‘ حالانکہ قرآن و حدیث سے اس کے بالکل برعکس ہدایات ملتی ہیں۔ اولاد‘ چاہے بیٹا ہو یا بیٹی‘ کا فرض عین ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کی خدمت کر کے ان کی دعائیں لے اور جنت کو ماں کے قدموں کے نیچے تلاش کرے۔ بیٹوں پر تو تادمِ آخر یہ فرض ختم ہوتا ہی نہیں اور بیٹی پر شادی سے پہلے تک لازم ہے کہ خود اپنی والدہ کی خدمت کر کے گھر کے کام کاج میں ان کی مددومعاون بنے۔ بیماری میں ان کو بھرپور آرام دے اور ان کی غیر موجودگی میں گھر کی ذمہ داری اٹھائے اور پھر بھی ان کے سامنے عاجزی سے کندھے جھکا کر رکھے۔ احسان بھری نظروں سے دیکھنے کی بجائے ان کا احسان مانتی رہے کہ انہوں نے مجھے خدمت کا موقع دے کر درحقیقت جنت کمانے کا موقع دیا۔ یہ اولاد کا فرض ہے۔

(جاری ہے)

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

بقیہ: عرضِ احوال

چھین لیا اور اس مسجد کو چرچ میں تبدیل کر دیا۔ ۱۱۹۱ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے عیسائیوں کو شکست دے کر غزہ فتح کر لیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران عثمانی ترکوں کا غزہ پر قبضہ تھا۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۸ء تک غزہ برطانوی کنٹرول میں رہا۔ ۱۹۴۹ء میں مصر کی حکمرانی میں دے دیا گیا' لیکن مصر نے فلسطینیوں کو اپنی شہریت نہ دی۔ ۱۹۵۹ء میں آلِ فلسطین حکومت ختم کر دی گئی۔ جمال عبدالناصر نے پین عرب ازم کے تحت اسے کنٹرول میں لے لیا' لیکن مصر میں ضم نہ کیا اور ایک مقبوضہ علاقے کی حیثیت دے کر وہاں فوجی گورنر کے ذریعے حکومت کی۔

جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۷۹ء میں اسرائیل اور مصر کے مابین ایک معاہدے کے تحت اس علاقے کی محدود خود مختار حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا۔ ستمبر ۱۹۹۳ء میں اوسلو معاہدے کے تحت' جو اسرائیل اور پی ایل او (تنظیم آزادیٔ فلسطین) کے درمیان ہوا' اسے فلسطین کا حصہ بنا دیا گیا اور یاسر عرفات مرحوم نے غزہ کو اپنا صوبائی ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ ۱۹۹۵ء میں ایک اور معاہدہ پی ایل او اور اسرائیل کے درمیان ہوا اور مغربی کنارے کی طرف بہت سے حصے کا کنٹرول فلسطینی اتھارٹی کو دے دیا گیا اور ۸۸ منتخب نمائندوں کی کونسل قائم کر دی گئی۔ مصر اسرائیل سے معاہدے کے مطابق جنوبی بارڈر کو کنٹرول کرتا رہا۔ یوں اسرائیل نے پی ایل او کو رام کر کے اپنے تئیں اپنی سیکیورٹی کو یقینی بنا لیا۔ جنوری ۲۰۰۶ء کے انتخابات میں حماس نے غیر متوقع طور پر اپنی حریف جماعت الفتح کو شکست دے کر اقتدار حاصل کر لیا۔ حماس کے لیڈر اسماعیل ہنیہ وزیر اعظم بن گئے' جو آغاز سے اسرائیل کے ساتھ معاہدات کی مخالفت کر رہے تھے۔ لہٰذا اسرائیل اور اس کے حواری امریکہ اینڈ کمپنی پریشان ہو گئے۔ انہوں نے محمود عباس جو اسرائیل اور مغرب دونوں کے فیورٹ ہیں' ان کے ذریعے ایک سال میں ہی اسماعیل ہنیہ کی حکومت برخاست کر دی' لیکن انہوں نے صدر کے احکامات کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ غزہ میں چونکہ انہیں زبردست حمایت حاصل تھی' وہ وہاں جم کر بیٹھ گئے۔ لہٰذا اقتدار دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ مغربی کنارے کا کنٹرول فلسطین نیشنل اتھارٹی (P.N.A) اور غزہ کا کنٹرول حماس کے ہاتھ میں آ گیا۔ محمود عباس کی سربراہی میں فلسطین نیشنل اتھارٹی تو اسرائیل کے سامنے سرنگوں ہو چکی ہے۔ اب غزہ میں حماس سے ہتھیار رکھوانے کے لیے اسرائیل امریکہ اور مغرب کی سرپرستی میں اس درندگی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

اسرائیلی یہودی یا امریکی اور یورپی عیسائی تو اسلام کے علانیہ دشمن ہیں۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کارروائیاں اور جنگ و جدل کرتے ہیں تو گلہ کرنا چہ معنی دارد! سوال یہ ہے کہ

مسلمان خصوصاً ان کے حکمران کس کھیل تماشے میں پڑے ہیں؟ اس کے سوا کیا کہیں اور کیا لکھیں کہ ؎ حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے! عرب ممالک کا یہ حال ہو چکا ہے کہ اسرائیل کی زبان اور بیان سے مذمت کرتے ہوئے خوف کھانے لگے ہیں۔ سعودی عرب کے شاہ عبداللہ نے فریقین کو تحمل و برداشت کا مظاہرہ کرنے کو کہا ہے۔ شنید یہ ہے کہ مختلف عرب ممالک کی طرف سے حماس کو بڑی بڑی رقوم اور عطیات کی آفر ہوئی ہے اگر وہ اسرائیل کے خلاف اپنی مزاحمت ختم کر دیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ عقل کے یہ اندھے جن کے دماغوں میں بھس بھرا ہوا ہے' انہوں نے کبھی تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی نہیں کیا۔ دشمن کبھی منت سماجت سے راضی ہوا ہے؟ امن کبھی بھیک اور خیرات میں ملا ہے؟ دشمن حالات کا صحیح ادراک رکھتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ عالم اسلام کو پیچھے کی طرف دھکیلتا جا رہا ہے۔ وہ اس کی پشت دیوار سے لگا دینا چاہتا ہے' اور سارے راستے بند کر کے بالآخر نیست و نابود کر دینے کی تیاریاں کر رہا ہے اور مسلمان ممالک ڈربے کی مرغیوں کی طرح ہیں جو ایک کے ذبح ہونے پر کہتی ہیں شکر ہے ہم بچ گئیں! وہ نہیں جانتیں کہ انہیں چند ساعت کی مہلت ملی ہے۔ مسلمان ممالک اگر مہلت سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو تباہی کے سوا ان کا مقدر کیا ہو سکتا ہے۔

دہشت گردی' قتل و غارت اور جنگ و جدل کے اس دور میں دنیا کی تمام تر توجہ میڈیا کی طرف مبذول ہے' خبروں اور تبصروں کے لیے آنکھیں اور کان اسی طرف لگے ہیں' لہٰذا میڈیا کا ذکر کیے بغیر بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ جس الیکٹرانک میڈیا کو ملالہ کے زخمی ہونے پر حد درجہ ملال ہوا' تھا یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ' سب سے بڑا سانحہ وقوع پذیر ہوا ہے' غزہ میں فلسطینی بچوں کی جگہ جگہ بکھری ہوئی لاشوں سے ان کا دل رتی بھر نہیں پسیجا۔ ان کی نظر میں شاید کیڑے مکوڑے مسلے گئے ہیں۔ اگر انسان صرف گورے ہیں تو رنگ تو ان بچوں کا بھی گورا تھا۔ ملالہ سے کہیں زیادہ سرخ و سپید' اور عمر میں اس سے بھی چھوٹے۔ کیا امریکی ڈالروں اور یو ایس ایڈ میں اتنی کشش ہے کہ خون بھی سفید ہو جاتا ہے' ضمیر بلڈوز ہو جاتا ہے' دل پتھر ہو جاتا ہے اور آنکھیں ماتھوں پر آ جاتی ہیں۔ شرم' غیرت' حمیت جیسے الفاظ اپنے معنی کھو دیتے ہیں۔ اس امریکی سنیٹر نے ٹھیک ہی کہا ہو گا کہ پاکستانی دولت کی خاطر ماں کو بھی بیچ دیتے ہیں۔ انہیں قارون کا انجام کیوں یاد نہیں۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہمارے بڑے کیا ہوئے' کہاں چلے گئے اور انہیں بھی چلے جانا ہے۔ کون آج تک بچا ہے جو یہ بچ جائیں گے؟ اسلامی ممالک کے سربراہ ہوں یا ہمارا سیکولر طبقہ' یہ آج تک کیوں نہیں جان سکے کہ دنیا میں مسلمانوں کے خلاف غیروں کا ساتھ دینے والے آخرت میں بھی غیروں کے ساتھ ہی ہوں گے۔ **وما علینا الا البَلاغ!!**

❁❁❁

Dec. 2012
Regd. CPL No. 115
vol. 61
No. 12

Monthly **Meesaq** Lahore

ہمارا دین "دینِ توحید" ہے اور "توحید" کی ضِد "شرک" ہے۔
شرک سب سے بڑا گناہ ہے اور نا قابلِ درگزر ہے۔
قرآن کی رو سے شرک "ظلمِ عظیم" ہے۔
شرک ہر دور میں نئی نئی صورتیں اختیار کرتا ہے۔
مسلمان جہالت اور نا سمجھی کے سبب شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

شرک کی حقیقت اور اس کی اقسام سے واقفیت' اور دورِ حاضر کے شرک سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے مطالعہ کیجیے:

حقیقت و اقسامِ شرک

بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ
کی چند فکر انگیز خطابات

معیاری کمپیوٹر کمپوزنگ ۞ عمدہ طباعت ۞ 128 صفحات
قیمت: اشاعت عام: 60 روپے' اشاعت خاص: 90 روپے

شائع کردہ: **مکتبہ خُدّام القرآن لاہور**
36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-35869501
email: maktaba@tanzeem.org Website: www.tanzeem.org

کھانسی، نزلہ، زکام
کسی موسم یا کسی وقت کے پابند نہیں
ہمدرد کی مجرب دوائیں ان کا علاج بھی ہیں اور ان سے محفوظ رہنے کی مؤثر تدبیر بھی

سُعالین
مُفید جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ سُعالین، گلے کی خراش اور کھانسی کا آسان اور مؤثر علاج۔ آپ گھر میں ہوں یا گھر سے باہر، سرد و خشک موسم یا گرد و غبار کے سبب گلے میں خراش محسوس ہو تو فوراً سُعالین لیجیے۔ سُعالین کا باقاعدہ استعمال گلے کی خراش اور کھانسی سے محفوظ رکھتا ہے۔

جوشینا
نزلہ، زکام، فلو اور اُن کی وجہ سے ہونے والے بخار کا آزمودہ علاج۔
جوشینا کا روزانہ استعمال موسم کی تبدیلی اور فضائی آلودگی کے مضر اثرات بھی دُور کرتا ہے۔
جوشینا بند ناک کو فوراً کھول دیتی ہے۔

لعوق سپستاں
نزلے زکام میں سینے پر بلغم جم جانے سے شدید کھانسی کی تکلیف طبیعت نڈھال کر دیتی ہے۔
اس صورت میں صدیوں سے آزمودہ ہمدرد کا لعوق سپستاں، خشک بلغم کے اخراج اور شدید کھانسی سے نجات کا مؤثر ذریعہ ہے۔
ہر موسم میں، ہر عمر کے لیے

صُدوری
مؤثر جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ خوش ذائقہ شربت۔ خشک اور بلغمی کھانسی کا بہترین علاج۔ صُدوری سانس کی نالیوں سے بلغم خارج کر کے سینے کی جکڑن سے نجات دلاتی ہے اور پھیپھڑوں کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔
بچوں، بڑوں سب کے لیے یکساں مُفید۔

سُعالین، جوشینا، لعوق سپستاں، صُدوری۔ ہر گھر کے لیے بے حد ضروری

ہمدرد
www.hamdard.com.pk